علمی، ادبی، تنقیدی، تاریخی مضامین کا بلند پایہ مجموعہ

حیدرآباد دکن

M.MIRZA

ادارہ

مدیرہ

[illegible]

ناظم

سید راشد جیلانی

مددگار

ارشاد محمد خاں، بی، ایس، سی (علیگ)

مشیر قانونی

آغا سید جعفر حسین، بی، اے، ال، ال، بی

جلد ۴ | فہرست مضامین ماہنامہ ارم ماہ ستمبر ۱۹۴۳ء مطابق ماہ آبان ۱۳۵۲ف | شمارہ ۴

سالانہ چندہ (للعہ)

اداریہ

تنقید یا جھنجلاہٹ

"ناشاد صاحب ہندی کا کھلا تنقیدی خط مدیر ارم کے نام" اس کا صحیح مفہوم کیا ہے۔؟ کم از کم ہماری سمجھ سے تو بالا تر ہے نظم کے لکھنے والے الہام صاحب اور شایع کرنیوالے مدیر صاحب "ہندستانی ادب"، اور کھلا خط لکھا جا رہا ہے کسی دوسرے کے نام۔ اگر اپنے خط لکھنے کا مقصد ناشاد صاحب ہمیں لکھ دیتے تو کسی چیز پر بحث کرنا ممکن تھا۔ اب تو صرف ایک خط ہے اور بس۔ جس میں تنقیدی عناصر سے زیادہ جھنجلاہٹ کا جز غالب ہے جھنجلاہٹ بھی ایسی جو کسی استاد کو اپنے شاگرد کے صحیح خیالات تک پہنچنے پر ہوتی ہے۔ درانحالیکہ بیچارہ شاگرد اس سلسلہ میں بےگناہ ہوتا ہے۔ ناشاد صاحب کے خط کا ابتدائی حصہ ملاحظہ ہو۔

"تاکہ الہام صاحب۔ اور اس قسم کے نو مشق شعراء کو اپنی غلطیوں کا احساس ہو۔ تاکہ وہ اس مجنونانہ بے راہ روی کو ترک کریں اور دامن ادب و شاعری کو اس طرح داغدار بنائیں۔ واقعہ تو یہ ہے کہ ایسے حضرات کا وجود ادب اور شاعری کیلئے زیادہ سے زیادہ خطرناک ثابت ہو رہا ہے۔"

ناشاد صاحب کی یہ تنقید اپنے میں انوکھا پن لئے ہوئے ضرور ہے۔ مگر تنقید کرنے والے کے سامنے بجائے لکھنے والے کے نام کے اور بار بار تخصیص کے۔ وہ جملے ہونے چاہئیں جو نظم یا غزل میں ہوں۔ نہ کہ مثال کے طور پر کسی ایک کا نام پیش کر دیا جائے وہ ہجو نما تنقید کرتے وقت۔ اس سے تو پڑھنے والا جو نتیجہ اخذ کرے گا وہ سوائے اسکے بھلا کیا ہو سکتا ہے کہ "وہ ناقد اور شاعر کے نتارے ملتے نہیں"۔ ناقد کا میلان کلی یہ ہونا چاہیئے کہ وہ کسی عبارت۔ غزل یا نظم کے مختلف پہلوؤں پر فن کے دائرے میں رہ کر اور فن کی کسوٹی پر ہر چیز کو پرکھے۔ بالکل اسی طرح جس طرح ایک سنار سونے کو کسوٹی پر پرکھتا ہے نہ کہ سونا پرکھنے کے لئے لانے والے کو۔

دنیا کی عام منڈیوں کی طرح ادب کی بھی ایک منڈی ہے جہاں ہر شخص مختلف النوع اجناس لیکر پہنچتا ہے کسی کے پاس اچھی ہوتی ہے۔ اور کسی کے پاس خراب۔ مگر یہ کبھی نہیں دیکھا گیا کہ خراب جنس لانیوالے کو دھکے دیکر باہر کر دیا گیا ہو۔ ایسی تنقیدیں اور تبصرے تو بجائے ہمت افزائی اور صلاحیت پیدا کرنے کے (۹۰) فیصد ہمت کو شکستہ کرنیوالی ہوتی ہیں۔ ناقد کا کام ہے کہ وہ شاعر یا ادیب کی خامیوں کو فن کے دائرہ کے اندر رہ کر جانچے اور اسے حدود قیود کے اصولات سے خبردار کر دے کسی ایک چیز کو صرف لیکر کہ "صاحب خراب ہے"۔ اس کی برائی کر دینا کہاں تک جائز ہے۔ کسی کے اس سوال کا جواب بھی تو ہونا چاہیئے "کیوں خراب ہے" اس کا ناقد کے پاس کیا جواب ہو سکتا ہے ہماری زبان کو فی الحال ایسے افراد کی ضرورت ہے جو زبان کو

وسعت دیں۔ اور ایسے افراد اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتے جب تک کہ ناقد حضرات حوصلہ افزائی نہ کریں۔ ناشاد صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں۔

پہلے تو یہ کہ آج کل اردو شاعری میں آزاد نظم کی بدترین وبا پھیلتی جا رہی ہے۔ یہ مرض خصوصاً ان نوجوانوں میں زیادہ پایا جاتا ہے۔ جو تہی مایہ اور ناقدر شناس ادب و شاعری ہوا کرتے ہیں۔ معریٰ نظمیں لکھنے والوں میں زیادہ تعداد ان "شاعر نما" یا خود ساختہ شعراء کی پائی جاتی ہے جو فن عروض سے یکسر بے بہرہ اور حقیقت شعر سے واقف ہوتے ہیں جہاں تک میں نے غور کیا ایسے شعراء کی معریٰ نظمیں صرف اس لئے لکھتے ہیں کہ وہ شاعری اور فن شاعری کی پابندیوں میں رہ کر شعر نہیں لکھ سکتے۔ اگر وہ قافیہ ردیف اور عروض کی قید و بند میں رہ کر شعر لکھنے کی کوشش کریں تو اس میں ان کی بے مائیگی ادب صاف ظاہر ہو جائے گی اور دوسری طرف ان کی جہالت کا فقدان بالکل صاف طور پر نمایاں ہو جائیگا۔ جس کی مثال سردار الہام صاحب (عثمانیہ) کا کلام اور ان کی پیش نظر نظم الجھن ہے۔

ہم نے الہام صاحب کی جس قدر بھی نظمیں دیکھی ہیں خواہ وہ مختصر نظمیں شاعرانہ قیود میں کیوں نہ ہوں وہ ایک طرف تو اردو شاعری کے حق میں مضرت رساں ہیں اور اگر بدقسمتی سے معریٰ ہوں تو بس ان کے نقائص کی تفصیل پہلے تو تضیع اوقات کا باعث اور پھر ان کے عیوب ناقابل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اب آپ نظم الجھن کے متعلق سنئے۔

اس معریٰ نظم کا پہلا مصرعہ ہے۔

"ستاروں کی جھرمٹ میں جب چاند کھل کر ذرا مسکرائے"

پہلے تو مصرعہ ساقط البحر ہے۔ معریٰ نظم اور مصرعہ ساقط البحر ہماری سمجھ میں نہ آیا۔ ناشاد صاحب فرمایئے معریٰ نظمیں لکھنے والے بحور و قیود میں رہتے ہی نہیں۔ پھر یہ بحث کیوں۔ رہا ستاروں کی تو ممکن ہے کاتب صاحب کی ستم ظریفی ہو کہ انھوں نے کے کو۔ کی۔ کر دیا ہو۔ چونکہ مکمل نظم ہمارے سامنے نہیں ہے اس لئے کچھ زیادہ لکھ نہیں سکتے۔ اب رہا یہ اعتراض کہ شاعر کا اس مصرعہ سے مطلب کیا ہے؟ ہمارے خیال میں تو شاعر سے سوال کرنے سے پیشتر اگر ہم ذرا اپنے دماغ پر دباؤ ڈالیں تو مطلب نمایاں ہو جاتا ہے "یہ ناقد صاحب کا تخیل" پر اعتراض ہمارے نزدیک تو عبث ہے اس کے علاوہ ستاروں کی (کے) جھرمٹ سے کیا ستاروں کا گروہ مراد ہے۔

ناشاد صاحب۔ گروہ نہیں کہا جاتا ہے بلکہ جمگھٹا کہا جاتا ہے اگر آپ جمگھٹا لکھتے تو شاعر کے مطلب سے قریب تر ہو جاتے۔ مصرعہ پر یہ فنی تنقید نہیں ہے اگر یہی خیال ہے تو یہ ایک بے تکی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ (بقیہ ملاحظہ ہو ۳۱)

ایکٹ

کردار

سیف ۔ ایک رئیس ۔
شمع ۔ اس کی بیوی ۔
جمرت ۔ بھیکارن ۔
رضا ۔ سیف کا نوکر ۔

{ شمع اپنی سنگار میز کے سامنے کھڑی بال درست کر رہی ہے ۔ پوڈر لگا کر بندے پہن لیتی ہے ۔ ساری کی سلوٹوں کو صاف کرتی ہوئی دروازہ تک آتی ہے }

شمع ۔ رضا ۔ او رضا! ۔ (کوئی جواب نہیں ملتا ۔ گیلری پر پنجرے میں بند طوطا آواز دینے لگتا ہے وہ طوطے کے پاس جاتی ہے اور غور سے دیکھتی ہے ۔)

شمع ۔ مرگیا کمبخت ۔ قسم لے لو جو اس پنجرے میں پانی دانہ ہو! رضا ۔ ارے او رضا!

رضا ۔ (اندر سے) جی ۔ جی ......

شمع ۔ کیوں رے طوطے کو دانہ پانی کون ڈالتا ہے، چار دن میکے گئی تو غریب کو ادھ موا کر دیا ۔

رضا ۔ صبح ہی تو ڈالا تھا سرکار!

شمع ۔ اب تو کچھ بھی نہیں ۔ ٹھیرو کمبختو! اب تم کو بھوکا رکھنا ہوگا ۔

رضا ۔ لیکن حضور ۔

شمع ۔ زیادہ مت بولو! ۔۔۔ جمرت کا آنا ہوگیا ۔

رضا ۔ جی ہاں ہوگیا .....

شمع ۔ پھر وہ اب تک یہاں نہیں آئی ۔

رضا ۔ وہ پرانے کپڑے مانگتی ہے ۔

شمع ۔ کیوں ؟ ۔۔۔ اچھا جا اسے یہاں بھیج دے ۔ اور دیکھ چائے اور ہم دونوں کے کھانے کو کچھ لے آ ۔

رضا ۔ جی اچھا ۔ (بڑبڑاتا ہوا جاتا ہے)

[شمع کرسی پر بیٹھتی ہے ۔ لیکن اسے کچھ یاد آتا ہے وہ الماری کے پاس جاتی ہے ۔ زیور پہن کر آئینے میں دیکھتی ہے ۔۔۔ جمرت داخل ہوتی ہے]

شمع ۔۔ جمرت آگئی ؟

جمرت ۔ (۔)

شمع ۔ پسند ہے ہمارا بنگلہ !

جمرت ۔۔ ہاں ۔

شمع ۔ تو ایسی ملول کیوں ہے موٹر میں تو اچھی ہنس بول رہی تھی نا اب کیا ہوا ؟

جمرت ۔۔ میں آپ کے گھر رہنے کے لایق نہیں ہوں۔

شمع ۔ کیوں ! میرے ہوتے ہوئے تجھے کیا فکر؟ تجھے یہاں کوئی تکلیف نہ ہوگی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہاں باندی بن کر نہیں بلکہ میری دوست بن کر آئی ہے ـــــ میں نے نوکروں کو تاکید کر دی ہے ۔

جمرت ـــــ نا بہن ۔ میں اتنی عزت کے لایق نہیں ہوں ۔

شمع ۔ کیوں فکر کرتی ہو جمرت ؟ ۔ ۔ ۔ نہ گھبراؤ

جمرت ۔ سچ کہوں ؟ ایسے دولت اور عیش سے بھرے ہوئے گھروں کو دیکھ کر میرا کلیجہ دھک سے ہو جاتا ہے.....

شمع ۔ آخر کیوں ؟

جمرت ۔ دولت ، سکھ اور آرام کی جگہ پھانسنے والوں کو زیادہ آسانیاں ـــــ

شمع ـــ کیا کہ رہی ہو جمرت ؟ ہمارے گھر میں تو کوئی ایسا ہے نہیں ۔

جمرت ۔۔ ایسے لوگ ہوتے یا نہیں ۔ یہ دن رات گھر میں رہنے والی عورت نہیں جان سکتی ۔

شمع ۔ میں نہیں سمجھ سکی ۔

جمرت ۔ جانے بھی دو ۔ مجھ پاگل کا پیچھا نہ کرو ۔

شمع ۔ پاگل نہیں تو اور کیا ـــــ یہ پھٹے کپڑے تو نے ضد سے کیوں پہنے ۔

جمرت ۔ غریبوں کو یہ بھی نہیں ملتے !

شمع ـــ لیکن میں تو تجھے دے رہی ہوں۔ ۔ ۔ ۔ زندگی بھر نباہنے کا وعدہ کر کے لائی ہوں ۔ پھر کیوں یہ حال ؟

جمرت ـــ بہن ! بھاری کپڑے دلکش اور موہ لینے والے ہوتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ہم جیسے بے سہاروں کو زیب نہیں دیتے ۔

شمع ۔ تمہارا جی نہیں چاہتا کہ تم بھی میری طرح خوبصورت نظر آؤ ؟ میں سمجھتی ہوں کہ تم مجھ سے ذرا زیادہ ہی خوبصورت ہو ۔ ہے نا !

جمرت ۔ داک دم ، طوطا خوبصورت ہے ۔ دل لبھا لینے والا ہے ۔ اسی لئے تو پنجرے میں بند ہے ۔!

شمع ۔ تمہیں آج ہو کیا گیا ہے ؟ آتے وقت کی چہل کہاں غائب ہو گئی ۔ پہلے تو میں نے تمہیں اس قدر اداس نہیں دیکھا !

جمرت ۔ کہتی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں یہاں سے چلی جاؤں تو ! بہن ! غصہ نہ ہونا ۔ تمہارا احسان زندگی بھر نہ بھولوں گی ! ۔ ۔ ۔ ۔ بالکل موت کی آخری گھڑی میں تم کو یاد کروں گی ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن اب میں یہاں سے جاتی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ـــــ

شمع ۔ مجھے دیکھتے ہی خیال ہوا کہ تو اچھے گھرانے کی ہے تو جو میرے پاس مانگنے آئی تو تیرا بھولا اور اداس چہرہ دیکھ کر کلیجہ مسوس گیا ۔ جب میں تجھے گھر لائی تو تین دن کی بھوکی تھی ـــ میں تجھے دلدری سے نکال کر یہاں اس لئے نہیں لائی کہ یہاں وہی تکلیف اٹھائے ۔

جمرت ۔ بہن ! اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ تم غریب

ماں باپ کی بیٹی ایسے دولت مند گھرانے میں بیاہی
گئی ہوتی میں تمہارے ساتھ نہ آتی ۔
شمع ۔ امیری اور غریبی دونوں حالتوں میں دل کی حالت
ایک جیسی ہوتی ہے جمرت ! تم لوگوں کو دکھیوں پر ترس
آتا ہے اور ہمارا دل لوگوں کی بے بسی پر نہیں پسیجتا یہ تم
کیوں سوچتی ہو ۔
جمرت ۔ امیر صرف دل بہلاوا سمجھ کر ترس کھاتے ہیں ۔
اس طوطے کو ایک دلچسپ چیز سمجھ کر ہی ....
[رضا طوطے کو دانہ پانی ڈال کر جمرت کی طرف پلٹ کر دیکھتا ہے]
شمع ۔ رضا ۔ چائے جلد لاؤ ۔
رضا ۔ جی سرکار ۔ (جاتا ہے)
شمع ۔ دولتمندوں نے آخر تمہارا کیا بگاڑا ہے ۔
جمرت ۔ دولتمندوں سے ہم غریبوں کو ڈر لگتا ہے ۔
اور پھر مجھ جیسی بے سہارا عورتوں کے لئے ۔
شمع ۔ آخر تجھے ہوا کیا ...... کسی نے کچھ کہا تو نہیں ۔
جمرت ۔ بہن ! اس شہر میں جونہی داخل ہوئی تو
مجھے بالکل الٹے پاؤں ہی لوٹ جانا اچھا معلوم ہوا ۔
مجھ پر بے وجہ طوفان ٹوٹنے والا ہے ۔ ایسا ....!
شمع ۔ یہاں قریب بیٹھو ! بیگانوں کی طرح کیوں بیٹھی
ہو ...... (رضا داخل ہوتا ہے)
رضا ۔ حضور ! یہ چائے اور یہ انگور اور سیب !
[کشتی میز پر رکھ کر] واپس جاتا ہے]
شمع ۔ (چائے بناتے ہوئے) تھوڑی چائے پی لو
شاید طبیعت سنبھل جائے ۔
{ جمرت چائے کے دو چار گھونٹ لے کر بیٹھ جاتی
ہے ۔ میووں کی طرف دیکھتی بھی نہیں }
شمع ۔ ارے کچھ کھاؤ نا جمرت ۔ ؟
جمرت ۔ بھوک نہیں ۔ بس میرے لئے چائے کافی ہے !
شمع ۔ دل پر آج کوئی ٹھیس لگی ہے ؟
جمرت ۔ (چپ)
شمع ۔ جمرت تو بالکل میری بہن کی طرح ہے
چند روز پہلے کہتی تھی نا کہ اپنی حالت سناؤں گی ۔ شاید
حالات سنانے سے دل کا بوجھ کم ہو جائے ۔
جمرت ۔ مجھ بدقسمت کی کہانی سے تمہارے نازک
دل کو صدمہ ہوگا .... لیکن تم میری محسن ہو ! میں
یہاں زیادہ دن رہ سکتی تو اپنے حالات سنا کر تمہیں
دکھی نہ بناتی ۔ لیکن اب میں یہاں ٹھہر نہیں سکتی ۔
اس لئے تمہاری خواہش ......
شمع ۔ کیا کہتی ہو ...... ہاں چل سنا تو !
جمرت ۔ یہ تو میری خوش قسمتی تھی کہ بدبختی کی گھنگھور
گھٹاؤں میں تم ہی بجلی بن کر آئیں ۔ ورنہ میں فاقہ کشی سے
کب کے مر چکی ہوتی ۔
شمع ۔ لیکن تمہارا یہ حال ہوا کیوں کر ؟
جمرت ۔ بہن تم مجھ بدنصیب کی کہانی نہ سن سکو گی
دنیا میں یہ دکھ کیوں ہے ؟ اور کیوں ہونا چاہیئے ؟
یہ تو میری سمجھ میں نہ آیا ۔ دنیا میں جانور اور پرندے تو

زندگی گذار دیتے ہیں۔ لیکن ہم انسانوں کو جینا نہیں آتا۔ مجھے
بڑی حیرت ہوتی ہے۔ یوں تو میں کچھ زیادہ لکھی پڑھی ہو
نہیں۔ پھر بھی یہ خیال آتے ہی میرا دل بے قابو ہو جاتا ہے

شمع ۔ آخر کوئی بات ؟

حسرت ۔۔ بات کیا خاک ؟ ۔۔۔ میں پیدائشی
بدنصیب ہوں یہ کہاں کا انصاف ہے ؟ مجھے تو کوئی
جواب نہیں سوجھتا۔ میرے والد کب مر گئے مجھے خبر نہیں
اس کا پتہ بھی کبھی میری ماں نے نہیں دیا۔

شمع ۔ (بات کاٹ کر) تو ماں کیا کرتی تھیں ؟

حسرت ۔۔۔ وہ محنت مزدوری کرتی۔ بچپن میں
کبھی مجھے بھی ساتھ لے جاتی تھی۔ وہ زندگیوں کیلئے
سے دن بھر محنت کرنی پڑتی تھی۔ رفتہ رفتہ
میں بڑی ہوئی تو مجھے ساتھ لے جانا بھی چھوڑ دیا
کبھی کبھی وہ میرے بیاہ کے باتیں کر کے اپنا دل بہلاتی
وہ اس کوشش میں تھی۔ اُسے بس ایک ہی دھیان
تھا۔ جیسے میرا بیاہ دیکھ کر اس کی زندگی کی معراج ہونیوالی
تھی ....

شمع ۔۔۔ اچھا۔ آگے کیا ہوا ؟

حسرت ۔۔۔ ایک دلفریب شیطان نے۔ اس کا
وہ لباس زرنگار میں کھبنے والا جسم اور رعب دار چہرہ
دیکھ کر تم خود کہہ اٹھو گی کہ میں اس پر الزام دے رہی
ہوں وہ باعزت اور شریف دکھائی دیتا ہے۔
تم اس کی طرف دیکھو تو مجھی ہی برا کہو گی ! ......

شمع ۔ وہ کیوں ؟

حسرت ۔۔ لیکن ایک طرح سے تو میں ہی مجرم ہوں ؟
اس کی محبت کا شکار ہو کر کیوں میں پاپ کی راہ پہ لگ
گئی ؟ لیکن بہن پریم ! محبت نے آنکھیں بند کر دی تھیں
اس نے مجھے امید دلا کر ۔۔۔۔

شمع ۔ شادی کی امید دلا کر ٹھکرا دیا ؟

حسرت ۔۔ شادی کی امید ؟ نہیں بہن میں کیا اس کے
برابر تھی جو وہ شادی کرتا۔ میں غریب وہ امیر ! کہاں
جھونپڑی کہاں بنگلہ ؟ کہاں ٹاٹ کہاں مخمل ؟ وہ
دس شادیاں کرتا تو بھی برا نہ مانتی۔ زندگی بھر اس کی
غلام رہ کر گزار دیتی ....

شمع ۔۔۔ تو پھر ؟

حسرت ۔۔۔ (آہ بھر کر) اس نے مجھ پر احسان کیا
پہلے تو اس کی عنایتیں بے لوث معلوم ہوئیں۔ اسی لئے
میں دیوانی ہو گئی ۔۔۔ !

شمع ۔۔۔ لیکن اس نے ایسی کیا مہربانیاں کیں ؟

حسرت ۔۔۔ ماں کی بالکل آخری گھڑیاں تھیں.....
ڈاکٹر بغیر فیس کے آنے سے رہا۔ بچپن میں مجھے ماں نے
ایک انگوٹھی بنا دی تھی۔ میں نے وہ ڈاکٹر کے میز پر رکھ دی
اس وقت یہ شخص وہاں موجود تھا..... مگر ڈاکٹر نے
انگوٹھی لینے سے انکار کیا۔ بیچنے کی غرض سے میں
بازار کی طرف ..... جوہری گلی سے ۔۔۔

شمع ۔۔۔ (حیرت و اضطراب) جوہری گلی ؟

یعنے ؟ اس شہر میں تجھ سے دغا کی گئی ۔ ...... ؟

جمرت ــــ (اپنی غلطی کے خیال سے گردن جھکا لیتی ہے)

شمع ــ جمرت، جمرت ! جمرت ؟ چپ کیوں ہو گئی ؟

جمرت ــ کیا بولوں ! ــــ راستہ میں وہ آدمی ملا اور مجھے دس روپیہ دیئے !

شمع ــ اور کچھ کہا اس نے ؟

جمرت ــــ اس نے کہا ــ اس وقت تم پریشان ہو ۔ جب تمہارا کام بن جائے تو میری رقم واپس کر دینا ــــ

شمع ــــ تو نے کیا جواب دیا ؟

جمرت ــ کیا جواب دیتی ! رقم واپس کرنے کا وعدہ کر لیا ۔ اور میں سمجھی کہ وہ بھلا مانس ہے ۔ ڈاکٹر کو گھر لے گئی علاج کرایا مگر ماں اچھی ہوتی نظر نہ آئی ۔ ان دنوں وہ شخص ماں کا حال پوچھنے آتا رہا ۔ اور ہماری حالت دیکھ کر مدد بھی کرتا رہا ــ میں دل ہی دل میں اس کی غلام بن گئی ! ــــ

شمع ــ (جمرت کو خاموش پا کر) ماں کب مر گئی جمرت ۔

دو مہینے ہو گئے ..... اس مصیبت کے وقت اس شخص نے میری بہت مدد کی ۔ اور پھر یہ کہہ کر "میں تیرا اچھا انتظام کر دیتا ہوں" دوسری جگہ لے گیا ۔

شمع ــــ کہاں لے گیا ؟

جمرت ــــ (اپنی ہی وطن میں) ایک علیحدہ گھر دلا دیا ۔ کسی چیز کی کمی پڑنے نہ دی ۔ اور آخر میں ان ساری عنایتوں کے سبب اس کے سکون اور خوشی کی خاطر میں نے اپنا جسم مبادلہ دیا ۔

شمع ــــ لیکن تو نے کچھ سوچا نہیں ؟

جمرت ــــ بہت سوچا ! اس نے میرے سکھ آرام اور اطمینان کا ذمہ لیا ۔ قسمیں کھائیں ۔

شمع ــ اور تو قسموں پر بھروسہ کر لیا !

جمرت ــــ تم مجھے الزام دے رہی ہو ۔ ٹھیک ہے ۔ لیکن اس وقت مجھے دنیا کا خیال نہ تھا ..... ؟ میں نے کب دنیا دیکھی تھی !

شمع ــــ اور تو نے بھروسہ کر لیا ۔

جمرت ــــ ہاں، مجھ جیسی بے سہارا عورت کیلئے اس سے زیادہ اور کیا چاہیئے تھا ۔ سکھ تھا، پیسہ تھا، وہ تھا ــــ اس کی محبت تھی !

شمع ــــ لیکن اس وقت تو نے شادی کی ہٹ کیوں نہیں کی جمرت ــــ اس وقت مجھے اس کی محبت میں شک نہ ہوا ۔ میں محبت کی بھوکی تھی ..... میں نے اس کی بیاہتا بیوی بننے کی آرزو نہیں کی اور یہ خواہش پوری ہو بھی نہیں سکتی تھی ــــ پیٹ بھر کھانا اچھا کپڑا ۔ اور اطمینان ! اور اس کی امرت جیسی محبت ...... اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ ساری دنیا کی حکومت میرے ہاتھ میں ہے ۔

شمع — لیکن شادی کرلی ہوتی تو —

جمرت — شادی ہی میں کیا رکھا ہے؟ شادی کے مرد کیا کم بدطینت ہوتے ہیں؟

شمع — (ٹھنڈی سانس) اچھا پھر کیا ہوا؟

جمرت — (چونک کر) ہائیں تمھیں کیا ہوا؟

شمع — کچھ نہیں۔ آگے بولو!

جمرت — ایسا کیوں کہہ رہی ہو بہن! میں تو صاف دل سے سب کچھ کہہ رہی ہوں۔ بالکل جگری دوست کی طرح پھر تم کیوں مجھے غیر سمجھ رہی ہو؟

شمع — بہن تو جو کچھ کہہ رہی ہے یہ بدقسمتی سے بہت کچھ سچ ہے۔ واقعی! شادی کے شوہر بھی غدار ہوتے ہیں —

جمرت — میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی؟

شمع — کوئی خاص بات نہیں..... جانے بھی دو!

جمرت — ہم جسے روشنی سمجھتے آئے ہیں۔ کیا وہ اندھیرا ہی ہے؟

شمع — میں نہیں سمجھی — پھر کیوں اس نے تجھے چھوڑ دیا؟

جمرت — ایک دن وہ میرے پاس نشے کی حالت میں آیا۔ اپنے ساتھ ایک دولت مند سیٹھ کو بھی لایا۔ اور..... اور.....

شمع — رک کیوں گئی؟ بول نا؟

جمرت — اس وقت ہماری محبت۔ کا تانا بانا الگ ہو گیا! پیسے کے لئے..... سیٹھ سے اس نے کچھ لیا تھا..

سیٹھ کی خواہش پر..... قرض کے بازار میں اس نے میری عصمت و حیا کو فروخت.........

شمع — (حیرت سے) کیا کہہ رہی.... ؟

جمرت — میں کہانی نہیں سنا رہی ہوں! — میں اس کا یہ حکم سنتے ہی گھر سے باہر ہو گئی۔ راتوں رات چل کر ایک گاؤں میں پہنچ گئی.....اور ہر گاؤں میں دو چار دن گذار کر تمہارے میکے پہونچی..... وہاں تین دن کھانا نہ ملا..... آگے کہیں جانے کی طاقت نہ تھی اچانک تم مل گئیں........ (گردن جھکا لیتی ہے)

[رضا داخل ہوتا ہے]

رضا — یہ سب لے جاؤں سرکار؟

شمع — ہوں — لیجاؤ —

شمع — ارے — صاحب گھر کب آتے ہیں —

رضا — (گھڑی کی طرف دیکھ کر) اب آتے ہی ہوں گے۔ تھوڑی دیر میں —

شمع — سیٹھ کیسا تھا جمرت!

جمرت — یعنے؟

شمع — یعنے شکل وصورت؟

جمرت — کالا، سانولا، موٹا سا۔ پستہ قد، چھدری مونچھوں والا!

شمع — (فوراً) اور وہ شخص!

جمرت — (ٹھنک کر) مجھے نہیں معلوم!

شمع — ارے ناراض ہو گئی؟ — نہیں تو نہ سہی!

جمرت ۔ میری جگہ تم ہوتیں تو کیا کرتیں ؟
شمع ۔ اس شخص کا گلا دبا کر ــــــ
جمرت ۔ (طنز اور نفرت سے مسکراتے ہوئے) وہی تمہارا گلا گھونٹ کر ....
شمع ۔ کیا کہتی ؟ تجھے اس شخص پر غصہ نہیں آتا ؟
جمرت ۔ اب تو خود اپنے آپ پر ہی غصہ آتا ہے۔ جی میں آتا ہے کہ کہیں جا کر جان دیدوں۔
شمع ۔ خودکشی انسانیت ہے ؟!
جمرت ۔ نہیں ! مجھ میں انسانیت تھی کب ؟ میں تو پاگل ہو گئی تھی ۔
شمع ۔ لیکن تو نے اس کی بری خواہش کی تکمیل نہ کی۔ کیا پاگل تھی اسی لئے نا ؟
جمرت ۔ اس وقت کی عقلمندی تو آج پاگل پن ہی معلوم ہو رہی ہے ۔
شمع ۔ پاگل پن ! ۔ وہ کیونکر ؟
جمرت ۔ خدا کرے ....
[زینہ پر جوتوں کی آواز آتی ہے ۔ جمرت دروازہ کی طرف پیٹھ کر کے کھڑی ہو جاتی ہے ۔ سیف کے داخل ہوتے ہی شمع مسکراتی ہوئی آگے بڑھتی ہے]
سیف ۔ ارے کب آئی ؟
شمع ۔ خط تو لکھ دیا تھا نا !
سیف ۔ ارے ہاں ۔ مگر میں کام کی زیادتی میں بھول ہی گیا ۔

[شمع نے اس کا کوٹ لے کر قریب کھونٹی پر ٹانگ دیا ۔ سیف کی نگاہ جمرت پر پڑی ۔ وہ ذرا جھجک گیا جمرت اس کی طرف دیکھ رہی تھی دیکھتے دیکھتے اس کا توازن بگڑا اور وہ گر گئی ۔]
شمع ۔ (بگڑ کر) یہ عورت تمہاری جانی بوجھی معلوم ہوتی ہے ۔
سیف ۔ (بے پروائی سے) کیا بات ہے ؟ .... کیا گاؤں کی تمام عورتیں میری ملاقاتی ہیں ؟
شمع ۔ (پانی لے کر جمرت کو چھینٹے دیتی ہے) جمرت ... جمرت . جمرت ، ۔
جمرت ــــ (ہوش میں آکر) میں کہاں ہوں .... تمہارے گھر ! میں جاتی ہوں ۔
سیف ۔ یہ کون عورت لائی ہو شمع ۔ ؟
شمع ۔ ایک غریب عورت بھیک مانگتی تھی ۔ آسرا دیا ..... تجھے بھی تو ایک خادمہ کی ضرورت تھی نا !
سیف ۔ امیروں کی عورتوں کو غریبوں پر ترس کھانے کی خطرناک بیماری ہوتی ہے ۔ یہ آج تک سنتا آیا تھا ۔ مگر آج معلوم ہوا کہ سچ ہے !
شمع ۔ لیکن بگڑا کیا ؟
سیف ۔ ایسی جوان اور غیر عورت ہمارے گھر ......
شمع ۔ کیوں !
سیف ۔ لوگوں کو انگشت نمائی کرنے اور ہمارے اخلاق پر

پھینٹے اڑانے کے لئے ......؟

شمع۔ (غصہ پی کر) لوگوں کو اپنا صرف اچھا ہی نظر آئے۔ اسی لئے نا؟

سیف۔ شمع کیا کہہ رہی ہو۔ تم سمجھتی بھی ہو۔

شمع۔ اچھی طرح۔ اور ظاہر بھی ہو گیا۔ جمرت پر نظر پڑتے ہی تم بہکے بہکے ہو گئے۔ میں سمجھی کہ پچھلے دنوں صرف سنی سنائی باتوں سے میں نے تمھیں سیدھی راہ پر لانے کے لئے چار کہانیاں سنائی تھیں۔ تم نے پرواہ نہ کی۔ اور الٹا دھمکی بھی دی تھی کہ رہنا ہو تو رہو ورنہ میکے کی راہ لے... اس وقت مجھے گمان ہوا کہ میں ہی غلطی نہیں کر رہی ہوں؟

سیف۔ پھر آج کیا ہوا!

شمع۔ تم مقروض بھی ہو...... (سیف گھور کر دیکھتا ہے) اس دھن راج سیٹھ کے بچے نے قرض کا تقاضا کیا تو تم نے اس کے بدلے جمرت ....

سیف۔ شمع سنبھل کر بات کرو! ایک بھکارن کی بات پر یقین کر کے مجھ سے بدگمان ہو رہی ہو۔

شمع۔ بے وجہ بدگمان؟ جمرت کو چوک میں دس روپے دینے والے آپ ہی ہیں نا؟ محبت کا جل دے کر کسی کی زندگی برباد کرنے والے آپ ہی! اور کیا ثبوت چاہیے؟

سیف۔ چپ رہو۔ ایک لفظ سننا نہیں چاہتا۔ ہوش حواس کے ساتھ میرے گھر رہ سکتی ہو ورنہ...... پندرہ منٹ وقت دیتا ہوں۔ تم اپنے متعلق فیصلہ کر لو...... اور پہلے اس بھکارن کو باہر کر دو۔ ورنہ تم بھی!

شمع۔ روز روز مجھے گھر سے نکلنے کے لئے نہ کہا کرو۔ یہ میں چلی۔ (طوطا ٹیں ٹیں کرتا ہے۔ سیف اسے نفرت سے گھورتا ہے)

سیف۔ دیکھو سوچ لو۔ میں نیچے جا رہا ہوں۔

جمرت۔ (سہمتی سہماتی) بہن بہن! میں جاتی ہوں۔ تم ان سے اچھی طرح نباہ کرو۔ بھلا بڑا سہارا ہے۔ اسے نہ چھوڑو۔ اسی میں تمہارا سکھ ہے۔ میں جا.....!

شمع۔ ٹھیرو جمرت! میں بھی چل رہی ہوں دونوں بھیک مانگ کر جو جی میں آئے کریں گے۔ دنیا کو ان مردوں کی خود غرضی اور مکاری سے واقف کرا کے اس ڈھونگ کے پول کو الگ کر دیں گے۔ یہ میں نکلی!

جمرت۔ اے ہے توبہ توبہ! تم جذبات سے مغلوب ہو تمہارے گھر میں اس کی حکومت ہو گی۔ اور ایسی کٹھن گھڑی آئے گی مجھے خیال بھی نہ تھا...... لیکن میری بدقسمتی ہاتھ دھو کر پیچھے پڑی ہے..... میں جاتی ہوں۔ مجھ بدنصیب کے لئے تم دکھی نہ ہونا۔ میں منت کرتی ہوں!

شمع۔ مردوں کا یہ ظلم..... یہ ناانصافی برداشت کرنے سے بھیک مانگنا بہتر نہیں؟

جمرت۔ اپنے سے چار نوالے پیدا کرنے جیسا کوئی ہنر کوئی ترکیب ہم عورتوں کے پاس نہیں ہے۔ صرف محنت مزدوری کر کے یا پھر وقت آنے پر بھیک مانگ کر جینا بھی مشکل ہے۔ بھکاریوں کی کوئی عزت نہیں۔

بھکاری سب کے غلام ہوتے ہیں۔ پھر بے سہارا عورتیں تو لوگوں کو ان کا اپنا مال معلوم ہوتی ہیں! ہر شخص اسی خیال سے ہمیں گھورتا ہے۔ تھوڑی سی بھیک دیتے ہوئے مبادلہ کے طور پر ہماری عصمت اور حیا مانگتا ہے۔.... قدم قدم پہ بے عزتی برداشت کرنی پڑتی ہے۔ یہی باتیں کسی کے گھر محنت مزدوری کرتے ہوئے بھی ہو جاتی ہیں۔ اس کے مقابلے میں یہ گھر والے کا ظلم کتنے درجہ کم ہے۔

شمع۔ یہ اس قدر خطرناک ہے مجھے معلوم نہ تھا..... تیرے پاس کسی کو لایا تھا ایسا ہی میرے پاس بھی کسی کو لا کر میری عصمت کا خون نہ کر دے؟

جمرت۔ وہ کتنا آوارہ ہو تو بھی یہ ممکن نہیں میری بات اور تھی۔ میں بن بیاہی تھی۔ اس پر میری کوئی ذمہ داری نہ تھی سماج کی نظروں میں میں اس کی بیوی نہ تھی۔ میری بے عزتی میں اس کی ہتک تھوڑی تھی۔ لیکن کم از کم خاندانی عزت کے خیال سے تم پر ایسا وقت نہ آئیگا۔

شمع۔ لیکن تو نے جو ظلم اور نا انصافی کو ٹھوکر لگائی؟

جمرت۔ غصہ کے جوش میں...... بے سمجھی تھی وہ۔ میں بھی اس عزت —— محبت کی آگ میں بیکار نہ جلتی مگر اب وہ آگ ٹھنڈی ہونے پر..... بھکارن کے بھیس میں دنیا کی ساری بے عزتیوں کے سہنے کے بعد بھی کھانے اور کپڑے کو نہ ترستی۔ مجھے آج معلوم ہوا کہ محبت کے جھوٹے تصور نے مجھے غار میں ڈھکیل دیا۔

شمع۔ نہیں۔ نہیں جمرت۔ تم غلطی کر رہی ہو۔ ایسی زندگی سے موت کیا بری ہے؟ چلو اٹھو۔ ہم دونوں جان دیدیں!

جمرت۔ میں کئی بار خودکشی کے خیال سے کنوؤں۔ تالابوں کی منڈیر پر لوٹتی رہی...... لیکن معلوم ہوا کہ جان دینا آسان نہیں ہے۔

شمع۔ تجھ اکیلی کا تجربہ کوئی ساری دنیا کا تجربہ تو ہے نہیں! مجھے تو یہ آزمانا ہے..... میں تو یہ ظلم برداشت نہیں کروں گی۔ جان گئی بلا سے...... چل!

جمرت۔ دیوانی نہ بنو..... ٹھنڈے دل سے سوچو (سامنے طوطے کی طرف دیکھ کر) یہ طوطے کو دیکھو! بیچارہ پنچھی، غریب! دروازہ کھولتے ہی اڑ جائیگا۔ مگر دور نہ جا سکے گا۔ انسان نے اس کی قوت و صلاحیت کتنی گھٹا دی ہے یہ اچھی طرح اڑ نہ سکے گا تو دوسرے شکاری پرندے ٹھونگیں لگائیں گے۔ اور آخر میں گرتا پڑتا...... کم از کم مرنے کے لئے وہ اس پنجرے میں آ جائیگا......

شمع۔ (بات کاٹ کر) وہ کیوں؟

جمرت۔ ایک دفعہ قفس میں بند کیا ہوا۔ پنچھی مرنے تک وہیں خوش رہتا ہے، قید اور غلامی ساری صلاحیتوں کو زائل کر دیتے ہیں...... اس میں جرات و ہمت باقی نہیں رہتی۔ پنجرے کے باہر اسے چین نہیں ملتا۔ یہی حالت ہم غریبوں کی ہے ورنہ حالات سے مجبور ہو کر۔ ویشیا اور طوائف کا پیشہ قبول کرنے والی بے شمار عورتیں مردوں کے ظلم اور بے رخی کے بدلے جان دیدیتیں..... لیکن دنیا

میں ایسا نہیں ہوتا .... ہم ان انسانی درندوں کی
بستی میں بے سہارا نکل جائیں تو چاہے کتنے ہی مستقل
مزاج کیوں نہ ہو۔ مردوں کے ایک طرفہ وار اور حیوانی
حملہ کے آگے پسپا ہونا ہی پڑے گا۔

شمع۔ غلط ہے! ایسا کیوں!

جمرت۔ ناہن! میرا سا حال ہوگا۔ نہ گھر نہ ناموس
نہ عصمت! صرف طوائف بن کر جب تک ہمارے
پاس جوانی اور خوبصورتی ہے۔ ساری دنیا کو بیچنے کے
سوا اور کچھ نہیں کر سکتے، اس کی نسبت سماج اور لوگوں
کی نظروں میں مرد اور شوہر کہلانے والے شخص کی طوائف
بن کر جینا کیسا برا ہے؟ کم از کم دنیا کا خیال کر کے شوہر
بڑھاپے میں اپنی بیوی کو چھوڑ نہیں سکتا ....

شمع۔ کیا یہ صحیح ہے؟ واقعی دنیا ایسی ہے؟

جمرت۔ ہاں۔ میں یہ سب اپنی ان کھلی آنکھوں سے
دیکھ چکی ہوں ..... تجربہ ہے۔ اسی لئے تو کہتی ہوں۔
بھلا بڑا سہارا تو ہے۔ اسے چھوڑنا اچھا نہیں۔

[سیف۔ داخل ہوتا ہے۔]

سیف۔ کیا سوچا۔

شمع۔ (روتی ہے۔ اپنے گھٹنوں میں سر دے سسک سسک کر
روتی ہے)

جمرت۔ (سیف کی طرف پیٹھ کر کے) بہن میں جاتی ہوں۔
میری خاطر خود کو تکلیف میں نہ ڈالو۔ میری جان کی قسم....

(چلی جاتی ہے)

شمع۔ جمرت! جمرت!! (ہچکیاں سسکیاں)

سیف۔ (کھڑکی سے دیکھتا ہے۔ جب وہ پھاٹک
سے باہر ہو گئی تو)۔ شمع ...... چلی گئی وہ! پیاری
اچھی بیگم اپنے سر کی ناگہانی بلا ٹل گئی۔ تم اپنے سکون
اور چین کے گھر میں یہ سب کی پڑیا کا ہے کو لے آئیں تھیں!؟

(شمع کا سر اٹھا کر اپنے زانو پر رکھ لیتا ہے اور
اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتا ہے)

اٹھو۔ چلو۔ باہر چلیں۔ آہاہاہا۔
تم کتنی اچھی ہو۔ بڑی شوخ، نٹ کھٹ!! ــــ

[باہر چلے جاتے ہیں۔] ڈراپ

اشتراکیت اور اسلام

اشتراکیت کے متعلق اسلامی نظریہ کیا ہے؟ کیا اشتراکیت
کے موجودہ اصولات ہمارے ماحول کے لئے کارآمد ہو سکتے
ہیں؟ اشتراکیت اصل میں کیا ہے اس کی حقیقی بنیاد کہاں سے
شروع ہوئی۔ مولانا عبد القادر صاحب مبلغ اسلام
نے ایسے مختلف عنوانات پر تفصیل سے بحث کی ہے
زبان صاف و شستہ ہے عام دماغ بھی آسانی سے پیش کردہ نظریوں
کو سمجھ سکتے ہیں۔ قبل بھی کئی ایک کتابیں اس سلسلے میں لکھی جا چکی
ہیں مگر عام فہم نہ تھیں۔ ہمارے خیال میں اس کا مطالعہ ہر ایک کیلئے ضروری
ہے اس کتاب کے صفحات (۴۸) ہیں اور قیمت ۱۰ آنے ہے۔ مکتبہ
ابراہیمیہ عابد شاپ، ادارہ اشاعت اردو عابد شاپ، غلام دستگیر
تاجر کتب عابد شاپ۔ حیدر آباد دکن سے یہ کتاب مل سکتی ہے۔

اقبال اور اردو

از
سلطانہ بنت لفٹننٹ کرنل
سید ذوالفقار علی
بی ایس، سی، عثمانیہ

اُردو کا مقابلہ دوسری ترقی یافتہ اور معیاری
زبانوں سے کیا جائے تو اس کی کم سنی کا لحاظ کرتے ہوئے
یہ ایسے ہرے بھرے درخت سے مشابہ معلوم ہوتی ہے
جس میں پھل پھول ابھی آنے کو ہیں۔ جس کی ابتدا ضرورت
کی بنیادوں پر ہوئی تھی۔ اسی زبان سے عام بول چال
کی زبان سمجھ کر بے اعتنائی برتی گئی۔ مگر شاعروں نے سب سے
پہلے اظہار خیال کا ذریعہ بنا کر
اسے وقعت دی۔
بعد میں آنے والے
شعراء نے اس میں
گہرائی وسعت اور زیبائی
پیدا کرنے کی کوششیں
کیں۔ ہندوستان میں
نہ صرف ہر جگہ سمجھی جانے
لگی بلکہ مختلف لسانی
علاقوں میں اتحاد پیدا کرنے والی یہی ایک مشترک
کڑی تھی اس کا ادبی سرمایہ بہت بڑا۔ غالب، میر جیسے
مسلم الثبوت استادوں کا تو کہنا ہی کیا یہ اپنے اپنے
وقتوں کے آفتاب سخن تھے۔ ستاروں نے بھی اس
نئی زمین کو آسمان بنانے میں کسر نہ چھوڑی سب کچھ ہوا۔
نئے فارسی عربی اور ہندی الاصل الفاظ آئے۔ جو ہماری
زبان میں رچ گئے نئے خیال نہ آئے تو کم از کم عجمی
فضا کا یہاں چربہ اتارنے کی کامیاب کوششیں ہوئیں

جو الفاظ اور خیالات جم نہ سکے متروک ہو گئے، علمی زبان
نہ تھی۔ مگر عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام نے اس زبان کی
لچک اور ہمہ گیریت پر دلالت کر کے علمی زبانوں
کی صف میں لا کھڑا کیا۔ بہر حال اُردو جاندار اور متحرک
ہو گئی لیکن یہ شمع ابھی کسی پروانے کی دلسوزی کی منتظر تھی۔
ایک غیر معمولی ہل چل اور ہنگامہ کی ضرورت تھی تاکہ
اُردو میں سے بیجا عناصر نکال
پھینکے جائیں پھر ضرورت
اچھے الفاظ اور
خیالات آئیں نہ صرف
یہ بلکہ ذخیرہ الفاظ سے
نئے نئے خوش نما اور
جاندار اسالیب بیان
پیدا کئے جائیں یہی
معلوم ہے کہ پاکیزہ اور
اچھوتے خیالات کے لئے ملبوس مناسب نہ ہو
تو خود خیالات کی قدر و قیمت کم ہو جاتی ہے۔
اردو میں نئے خیالات اور نیا طرز ادا عنقا تھا۔ اور
فارسی شاعری کے تتبع میں بہت کچھ ہوا مگر بالآخر
چھوٹے موٹے شاعر نے انہیں باتوں کو بالکل ویسے
ہی الفاظ میں دوہرانا شروع کیا تو شاعری نہ رہی جگالی
بن گئی۔ سخت ضرورت تھی کہ غالب کی طرح کوئی
نئی شخصیت نئے طرز سے دنیا کو دیکھنے کے بعد نئی شاعری

کا آغاز کرے پھسپھسی اور قدامت کی بندشوں میں جکڑی ہوئی شاعری کو آزاد بلند خیال اور زندگی کے نغموں سے مامور کرنے کی ضرورت تھی۔ بے جان نظم و نثر میں روح پھونکنے یا ایسا نہ ہو سکے تو نیا ہیولیٰ بنا کر اسی میں نئی روح داخل کرنے کی ضرورت تھی۔ یہ کام جتنا غیر معمولی تھا۔ اتنا ہی غیر معمولی ہمت اور آسمانی وجدان کا طالب تھا۔ یوں تو حالی اکبر الٰہ آباد اسمٰعیل میرٹھی نئے راستوں پر چل رہے تھے مگر رہبرو آنہ انداز میں رہبرانہ شان ان میں مفقود تھی۔ ان کے پاس زاد سفر نیا نہ تھا۔ وہی قدامت اور اس کے وہی پرانے ملبوس ان کے پاس تھے۔ بعض درحقیقت نئے راستوں پر چل بھی نہیں رہے تھے بلکہ صرف چلنے کا انداز نرالا تھا۔ بہرحال شاہ راہ کی کسی کو خبر نہ تھی اور نہ کسی شہسوار کے لئے بے چینی ــــ

آنے والی نسلیں اردو کے محسنوں کو ہمیشہ یاد رکھیں گی خصوصاً اقبال کو جنھوں نے اردو کو اپنی حقیقت نگر نگاہ و فکر سے مالا مال کر دیا۔ انھوں نے اپنی ایسی نئی طرز نکالی جو بلحاظ حسن معنوی اور ظاہری نہ صرف پہلی ہے بلکہ اپنی قسم میں آخری بھی ــــ

موجودہ شعراء اور ادیب ان سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔ جس کی مثالیں ہمیں جا بجا ملتی ہیں۔ مگر اصلی متاثر ہونا قوم کا ہے اور خوبی اس کی ہے کہ اقبال کی آواز پر لبیک کہنے والے بڑھتے جاتے ہیں۔ جس طرح انسانوں کو جانوروں پر نطق کے معاملہ میں فضیلت تامہ ہے اسی طرح قوم کو اپنی انفرادیت اپنی ہستی برقرار رکھنا ہو تو ایسے نطق کا خیال رکھنا چاہیئے۔ ہمارا مطلب زبان سے ہے اور اگر ہمیں جینا ہے تو ہم زبان کو مردہ اور گدھوں کو اس پر منڈلاتے نہیں دیکھ سکتے۔ زبان کی اس غیر معمولی اہمیت کے مدنظر اردو کی بے جانی بے حد غور و خوض کی دعوت دیتی تھی۔ غزل، قصیدہ اور پھر مثنوی اردو کا جامہ بہت اچھی طرح پہن چکے تھے۔ رباعی اور مسدس سے ہماری نظریں کچھ کچھ آشنا تھیں مگر ان میں سب سے مقبول بلاشبہ غزل تھی، غزل جو پہلے محض معشوق سے یا معشوق کے متعلق واردات قلب اور کیفیات بیان کرنے کے لئے مخصوص تھی۔ وسعت اختیار کر کے اپنے دامن میں عشق حقیقی تصوف اور فلسفہ کو بھی سمیٹ رہی تھی غالب نے خصوصاً اس کو منتہائے کمال پر پہنچا دیا نئے خیالات کے علاوہ فارسی الفاظ اور خوشنما ترکیبیں رائج کیں اس ضمن میں ہم مومن کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ جنھوں نے سادگی اور سلاست زبان اور اس وجہ سے پیدا ہونے والے خاص اثر میں غالب سے میدان مار لیا۔ ذوق شاعر نہ تھے وہ کوشش کرنے کے بعد اچھے قصیدہ گو ضرور بن گئے۔ داغ بھی اسی مدرسہ سے تعلق رکھتے تھے اور انھوں نے محاورہ اور روزمرہ کی چاشنی سے تغزل میں عجب صوفی کا رنگ پیدا کیا۔ لکھنؤ کے

گروہ نے زبان میں لوچ نزاکت اور نفاست پیدا کی۔
قصہ گوئی اور مثنوی کو فروغ دینے میں ان لوگوں کا بہت بڑا
حصہ ہے میر حسن کی مثنوی ہمارے سامنے بطور نمونہ اور معیار
ہمیشہ رہ سکتی ہے۔ لیکن لکھنو کی غیر معمولی مادیت پرستی، عریانی
اور بازاری پن کے خلاف، انیس اور دبیر کا رد عمل معنی خیز
اور قابل غور ہے انھوں نے اردو میں رزمیہ اور بلند تر
انسانیت کے متعلق شاعری کا ویسا ہی اضافہ کیا جیسا
فردوسی اور ہومر وغیرہ نے۔ فرق اول الذکر کی نگاہوں
کا قومی غبار سے پاک ہونے میں آتا ہے۔ غزل میں
ایک خامی تھی۔ ایک شعر میں ایک ہی خیال ادا ہو سکتا
تھا۔ اگر تسلسل خیالات قایم رکھتے تو غزل غزل نہیں
رہتی تھی۔ قطعہ بن جاتا تھا۔ جس میں وہی ردیف اور
قافیہ کی بندشیں ہوتیں۔ قدما میں سے کسی نے نظم کی
طرف رخ نہ کیا۔ شاید اس کی ضرورت ہی نہ ہوئی۔
اور اگر ایسی مشکل آن پڑی تو قصیدہ مثنوی اور قطعہ
نے کام چلانے میں مدد دی۔ بہر حال عشق۔ جیسے مجازی
سمجھ سکیں نہ حقیقی۔ ہماری شاعری کا خاص موضوع رہا۔
ہم اپنے زمانے اور خیالات کے لحاظ سے قدما سے
متفق نہ ہوں تو نہ ہوں مگر ان کی عظمت اور ان کی اردو کی
بے مثل خدمت سے انکار نہیں کر سکتے۔ اگر یہ لوگ
نہ ہوتے تو آج اردو وہ اک چیز لچر سی بزبان
دکنی،، ہوتی۔

حالی نے بہت اچھی طرح محسوس کیا کہ اپنے
خیالات کے اظہار کے لئے تنگنائے غزل کو ذریعہ
بنانا نامناسب تھا۔ مسدس کی طرز اور نظم کو اختیار
کر لینے سے ان کو اپنے درد بھرے لیکن ماضی سے
مخاطب نغمے سنانے کا ذریعہ مل گیا۔ لیکن ان کی شاعری
جوش اور ہمت سے تہی دامن تھی۔ وہ ماضی کو اپنی
پوری قطعیت کے ساتھ واپس آتے دیکھنا چاہتے تھے
تقلید کی نصیحت نمایاں تھی کہ مسدس اسلام
کا پر جوش استقبال ہونے کے باوجود عوام پر گہرے
اثرات ڈالنا ناممکن ہوا۔ وہ واعظ اور ناصح
تھے اور زمانہ پیغمبرانہ روح کا متقاضی۔ جب قوم
بے حسی اور بے حرکتی کا شکار ہو تو سب سے پہلے ذہنیت
بدلنا ضروری ہے تا کہ فکر و عمل بدلے اور زندگی پیدا
ہو۔ یہ کام فقط اقبال سے ہو سکا اور اس کے لئے
وہ تمام تعریفوں کا مستحق ہے۔ زمانہ کے ساتھ چل کر اور
اس سے آگے نکل کر خود زمانے کو اپنے ساتھ چلانا۔
کسی کی بس کی بات نہیں۔ مغرب مادی اور ذہنی دونوں
حیثیتوں سے ہم سے آگے تھا۔ وہاں نئے شاعر
فلاسفی، مفکر، سائنس دان وغیرہ دنیا معاشرت
مذہب کائنات کے متعلق نئے زاویوں سے بحث
کرتے تھے۔ اور ان کے ذہن ہمیشہ تجسس اور شبہات
سے پر رہتے۔ ہر قدم اٹھانے کے بعد انہیں فوراً
اس خلجان میں مبتلا ہونا پڑتا کہ آیا یہ قدم ہم نے
منزل کی طرف اٹھایا بھی ہے۔ عقلی اور منطقی حیثیت سے

ٹھیک ٹھاک بھی ہے۔ بعد سب سے بڑھ کر آیا ہماری منزل ہمارا مقصد حقیقی ہے یا محض مقصد حقیقی سے تھوڑا نزدیک ایک سنگ راہ یعنے وہاں ہمیشہ حرکت مسلسل چل چل اور لمحہ بہ لمحہ تقادم تھا اور یہاں صدیوں کے وہم اور خالی خولی خیالات اور رکھا جا ہوا لے تعصبات کا انبار کہ شاعر صوفی ادیب حاکم اور محکوم سب ہی پر حادی سب ہی پر بوجھ ڈالے ہوئے۔ مصیبت یہ کہ اس حالت کو بدلنے سے قطعی انکار تھا۔ سائنس کی طرف حد درجہ بے اعتباری اور خوف سے بھر نظر ہی تھی تھیں بعد اپنی بے عملی کی تاویل قناعت اور توکل کے ذریعہ کی جاتی تھی۔ غرضکہ ہر چیز ان کی نظروں میں مذہب کی شریعت کی دشمن تھی اور اس پر خود غلط خیال کے بموجب ناقابل قبول ——— ہر آزاد خیال اور ترقی پسند کو برا خیال کیا گیا۔ سوسائٹی میں نیچری کا ٹھپہ لگا کر مقاطعہ کروانے کی کوششیں کی گئیں۔ ہر طرح کی رکاوٹیں ان کی راہ میں ڈھکیلی گئیں۔ مگر ترقی کے قدم نہ رکنا تھے نہ رکے۔ اس کش مکش اور قوم کی ذہنی خانہ جنگی کا اثر ادب پر پڑنا ظاہر تھا جو قوم کے شعور کا آئینہ ہے۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ انیسویں صدی عیسوی کے اختتام تک ہمارے شاعر اور ادیب سرگشتۂ منزل اور ویرانوں میں بے مقصد دو گشتہ ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ پھر وہ زمانہ آتا ہے کہ حکومتی تقسیم اور جغرافی حدود کی بنا پر قومیت ( ) کو اپنے ہر درد کا مداوا سمجھ کر اس طرح اپنایا جاتا ہے کہ اس سے پیدا ہونے والے امراض کو مسعود اور تندرستی کے ضامن سمجھتے ہیں۔ اس دور میں اردو غیر معمولی طور پر نئے خیالات سے (جو مغرب سے دھڑا دھڑ ورآمد کئے جا رہے تھے) اور نئے طرز نگارش سے سنواری جاتی ہے۔ بحیثیت زبان اس کو زیادہ نقصان نہیں پہنچ سکا کیوں کہ زبان کی وسعت اور حجم میں اضافہ ہوا لیکن یہ وسعت کھوکھلی تھی جس میں قدامت کی آوازیں گونج کر نہایت پر ہیبت بن جاتی تھیں۔

اسی زمانہ میں نظم یوں کہیئے کہ حقیقتاً ایجاد ہوئی۔ قومی نظموں کی وہ بھرمار ہوئی کہ خدا کی پناہ لیکن اس عظیم الشان سیلاب میں پیش پیش موجیں اقبال کی بھی تھیں ان کی وہ نظمیں آج بھی اپنے غیر معمولی خلوص اور وطن سے محبت میں سب سے الگ بلند مقام پر ہیں۔

لیکن اقبال کی طبیعت نے پلٹا کھایا اور قومیت کی تنگ نظری اور بے رحمیوں سے وہ جلد خبردار ہو گئے۔ اور پھر انھوں نے انسانیت کے لئے ایک ہمہ گیر نظام تلاش کرنے میں اپنا وقت عزیز صرف کیا اسی وقت سے ان کا حقیقی اور لازوال عروج شروع ہوتا ہے۔ زمانے کے ساتھ تھوڑی دور

وہ مزدو سے چلے لیکن پھر آگے بڑھ گئے حتیٰ کہ زمانہ ان کے
قدم ملانا ناگزیر ہوگیا۔ ایک ذہنِ خدا داد کے لئے
کم خوشی نہیں۔ اگر ہم عصر اسی بصارت اور بصیرت کے
متلاشی ہوں جو اسے نصیب ہے غالب کے ساتھ
ان کے ہمعصروں کی بے رخی کافی تکلیف دہ ہوگی!

اقبال کی صحیح قدر و قیمت کا کچھ اندازہ
لگانے کے لئے ہمیں اردو کی وہ تہی دامانی دیکھنا
چاہیئے جو ان کا (اور ان سے متاثر شعرا کا بھی)
کلام ہٹا لینے پر پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کے بلند
خیالات حکیمانہ تنقید میں غیر ملوث اور درماندگی
سے بلند نظریہ حیات اور پھر ان تمام کے لئے جامہ
زیب زبان دلآویز طرز تخاطب نئی نئی تشبیہیں
حیران کرنے والے استعارے جو اب ہماری زبان
کا مستقل سرمایہ بن چکے ہیں ایسے نہیں کہ آسانی
کے ساتھ بے نیازی سہہ لیں۔ بلکہ اگر ہم کوشش
بھی کریں تو اقبال سے بچ نہیں سکتے انھوں نے
اردو کو ظاہری اور معنوی جدتوں اور مستحکم نئے
قدموں سے زندگی بخش دی۔

اگر ہم اقبال کے کلام کو ظاہری حیثیت کے
لحاظ سے پرکھیں تو سب سے غیر معمولی امر جس کا
احساس ہمیں ہوتا ہے وہ ان کا غزل کو ترک
کر کے نظم کو استعمال کرنا ہے وہ فن برائے فن
سے چنداں خوش نہ تھے۔ اس نظریہ سے ہمیشہ
انھوں نے بیزاری کا اظہار کیا اور یہی کہا کہ "فن کو کسی
اعلیٰ تر مقصد کے لئے حق بجانب قرار دے سکتے
ہیں ورنہ اس کی کوئی ضرورت نہیں"۔ باوجود
اس خیال سے ان کی فن کاری ناقابل انکار اور
متحیر کن ہے۔ نظم کی پوشیدہ وسعتوں اور اس کے
امکانات کو سب سے پہلے انھوں نے تلاش کیا
اور ان کی مثال نے دوسروں کو غزل کے استعمال
سے ہٹ جانے پر آمادہ کیا۔ غزل شاعر کے بال و
پر تخیل پر نہایت گراں بوجھ تھی بجائے اس کے کہ
شاعر اپنے خیالات آزادی اور روانی کے ساتھ
ظاہر کر سکے وہ ردیف و قافیہ کے لحاظ سے
خیال تلاش کرنے میں سرگرداں رہتا تھا۔ جیسے
بمشکل تمام پہلے اس میں زبردستی روح پھونکنا پڑتی
تھی اور وہ ایسا نہ کر سکا جو اکثر ہوتا تھا تو کلام بے مزہ
بے جان اور فرسودہ ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ ردیف
اور قافیہ بھی موزوں ملنا مشکل تھے کیونکہ اردو کوئی
عربی یا فارسی کی طرح ایسے موزوں الفاظ سے
مالا مال زبان نہ تھی ان تمام بندشوں کی وجہ سے
شاعر بھی جکڑا رہتا تھا۔ اور شاعری بھی۔ ہم غزل کا
متاع حیات نہایت کم پاتے ہیں۔ خاص خاص
خیالات کو ہر شاعر نے اپنی غزل میں دھرایا ہے
اور یہ تکرار کسی طرح معمولی شاعروں کے کلام میں بھلی
نہیں لگتی۔ نظم میں تسلسل خیال قایم رہنا آسان اور

حق بجانب تھا۔ حالانکہ غزل اس کی متحمل نہ تھی غزل
میں شروع سے آخر تک ایک ہی مائیے کے ردیف
و قافیہ کے سہارے شاعری لڑکھڑاتی چلتی تھی۔ مگر نظم
میں ہر شعر کے لئے الگ ردیف و قافیہ استعمال کیا
جاسکتا تھا۔ یعنی جولانیٔ طبع دکھانے کے لئے شاعری
کے لئے بڑا میدان موجود تھا۔ اقبال نے نظم کی ان
خوبیوں کو سمجھتے ہوئے اپنے تمام خاص کلام فکر و نظر
کے معجزوں کو نظموں میں ہی ظاہر کیا۔ غزل کا استعمال
انھوں نے محض شوقیہ کیا ہے اور خال خال۔

انھوں نے ایک اور قدم بھی آگے بڑھایا جب قوافی
کو ترک کر کے محض ردیف ہی استعمال کرنا شروع
کی۔ ان کی طویل نظمیں مثلاً خضر راہ، شمع، شاعر
مسجد قرطبہ، والدہ مرحومہ کی یاد میں، وغیرہ
سب اس لحاظ سے نظمیں کہلائی جاسکتی ہیں کہ تسلسل
خیال برقرار رکھا گیا ہے۔ لیکن بیت کا استعمال
ان سب میں بھی نہیں بلکہ دوسری چھوٹی نظموں میں ہے
ان نظموں میں انھوں نے چھ سات اشعار کے
وقفہ سے ردیف بدلی ہے۔ قافیہ کہیں بھی نہیں
استعمال کیا گیا۔ یہ بھی ان کی ہی جدت ہے۔ بلکہ
بعض نظموں خصوصاً ضرب کلیم کے "محراب گل
افغان کے افکار" میں انھوں نے چھ سات اشعار
کے بعد مصرعوں کا وزن بدلا ہے۔ اس سے نہایت
خوشگوار تنوع اور رقصاں ترنم کا شدید احساس ہوتا ہے
اور پڑھنے والا فیصلہ نہیں کرسکتا کہ کس خوبی پر زیادہ
سر دھنے نظم کی روح یعنی خیالات سے لطف
اٹھائے کہ زبان کی چاشنی اور وزن کی دلپذیر
تبدیلیوں سے محظوظ ہو۔

غرض کہ اقبال ایک "بندۂ آزاد" تھے
مثنوی کے طرز میں انھوں نے صرف ایک "ساقی
نامہ" لکھا ہے جو بال جبریل میں شامل ہے۔ باقی
انھوں نے مثنوی کو بھی زیادہ توجہ نہ دی کیوں کہ
اردو میں مثنوی کے نام کے ساتھ ہی فوراً ایک خاص
وزن کا تصور نہ کرنا محال تھا یعنی وزن کی بندش
یہاں بھی تھی اور بعض موضوعات کے لئے قطعاً
نامناسب۔ وزن کا استعمال کرنا ان کے فنی ذوق
سے بعید۔ غزل اور نظم کے لئے بھی مسدس اور رباعی
کی طرح اوزان مخصوص ہوگئے تھے۔ انھوں نے
اپنی غزل میں جو وزن اچھا لگا اور مناسب معلوم ہوا
استعمال کیا ہے اور پرانے ڈگر پر چلنے کی نہ خاص
کوشش کی ہے اور نہ آج کل کے شعرا کی طرح انگریزی
(　　) کی اندھا دھند
تقلید کی سعی۔

تشبیہ اور استعارے زبان کی جان ہوتے
ہیں اور ان کی مدد سے جو کامل تصویریں کھینچی
جاسکتی ہیں وہ سادہ زبان سے ممکن نہیں۔ اقبال
تشبیہوں اور استعارات کے "بادشاہ" ہیں۔

وہ حسب ضرورت الفاظ کو جماتے ہیں حذف کرتے
ہیں ایک تشبیہ رہ آتے ہیں اور شعر مکمل ہو جاتا ہے۔
اور اپنی جگہ پر کامل پرانی تشبیہیں انھوں نے استعمال
نہیں کیں کیوں کہ وہ نگاہوں کے سامنے کوئی خاص تصویر
کھینچنے سے قاصر ہوگئی تھیں۔ کثرت استعمال نے ان میں
یکسانیت اور روکھا پن پیدا کر دیا تھا۔ بانگ درا،
شروع سے آخر تک پڑھ جائیے بلکہ اسی پر کیا منحصر
ہے ان کی باقی دو کتابیں بھی شامل ہیں۔ اس زمرہ میں۔
ہر جگہ ہر قدم پر نئے نئے مناظر نیا حسن نئی رعنائی خیال
ملتے ہیں۔ اردو کی لچک اور وسعتوں پر حیرت
کے مارے تعریفی کلمات کہنا ناممکن اور بے سود سا معلوم
ہوتا ہے۔

اب ہم اگر کوشش بھی کریں کہ ظاہری خوبیوں
اور جدت ادا کو چھوڑ کر ان کے خیال کا احاطہ کرنے
کی سعی میں مصروف ہوں تو اس عظیم الشان کام کے
آگے ہمت جواب دیتی معلوم ہوتی ہے۔ اردو کی
قسمت اور انجام پر ہمیں مایوس ہونے کی کوئی وجہ
نہیں اقبال کا کلام زندہ جاوید ہے اور اس لئے
اردو بھی ــــ

اقبال کی دوررس نگاہیں مسائل حاضرہ
کی تہہ تک پہنچیں اور ان کا اثر و تعلق ہم پر دنیا کا
مستقبل قومیت رنگ و نسل کے عقیدے اسلام
سے ان کے بنیادی اور اصولی اختلافات سوشلزم
اور اس کی اسلام سے نزدیکی غرض کہ ایک طرف
انھوں نے ہمیں اپنے آپ دیکھنا۔ اپنی روشنی
اور دوسرے کی روشنی میں ــــ سکھایا اور
دوسری طرف جب فرد میں موت کے آثار رونما
ہو رہے تھے ان کی تشخیص کی اور زندگی حاصل کرنے
کے لئے آبحیات کا رستہ بتلایا وہ افراد میں مسیحی
کردار دیکھنا چاہتے تھے وہ اس مرد حق پرست۔ حق گو
کے متلاشی تھے جو مشکلوں رکاوٹوں حالات کی مخالفت
غرض کسی چیز کی پروا نہ کرے جو راہ حق میں نہایت
بے باکی جرأت اور مستقل مزاجی سے چلے۔ اقبال
قوم میں ایسے آدم دیکھنا چاہتے تھے۔ جن کی تلاش
خود خدا کو ہو! جو خدا سے کہہ سکیں۔

"تیرا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد"

ان کا کارنامہ حیات۔ فلسفہ خودی۔ سوائے
اس مرد مجاہد کے تصور کے اور کچھ نہیں۔ (باقی)

یادِ ایام

(علامہ ڈاکٹر اقبال مرحوم کی تعلیمات سے متاثر ہو کر)

حضرت کاہش حیدرآبادی

رہی ہے کاوشِ تعمیرِ عالم رائیگاں برسوں ٭ بہا کی ہے یونہی یہ کشتیٔ بے بادباں برسوں
زمانہ فطرتاً اک وضعِ سیمابی کا حامل ہے ٭ رہے ہیں یونہی گردش میں زمین و آسماں برسوں
پلائی تھی مجھے وہ چیز ساقی نے سرِ محفل ٭ نشہ جس کا رہا ہے بے نیازِ این و آں برسوں
نظاروں نے ہی دی تھی دعوتِ فکر و نظر مجھ کو ٭ حجابِ حسن میں دیکھی ہیں میں نے بجلیاں برسوں
بہر صورت دلِ ناشاد مجبورِ تمنا ہے ٭ رہا ہوں انتہائے غم میں پھر بھی شادماں برسوں
کسی شے کی کمی شدت سے میں محسوس کرتا تھا ٭ رہا ہے مجھ کو بھی اندیشۂ سود و زیاں برسوں
بدل سکتی ہے چاہوں تو مہ و انجم کی تقدیریں ٭ رہا ہوں عالمِ کون و مکاں پر حکمراں برسوں
مرے خونِ جگر نے پرورش کی ہے بہاروں کی ٭ رہی ہے داستانِ لالہ و گل خونچکاں برسوں
مرے گن گائے جاتے ہیں زمین و آسمانوں میں ٭ رہا ہے میرا جبریلِ امیں بھی رازداں برسوں
مری عظمت کا پرچم کوہساروں کی بلندی پر ٭ مری ہستی رہی ہے باعثِ کون و مکاں برسوں
رہی ہے مجھ کو بھی نسبت مقامِ عرش و کرسی سے ٭ مرے سجدوں سے تھا معمور سنگِ آستاں برسوں
رہی ہے مجھ کو بھی حاصل شناسائی ستاروں سے ٭ چراغِ طور بھی رکھا ہے میں نے ضوفشاں برسوں
مرے نالے حریمِ عرش کو چھو کر نکل جاتے ٭ اگر رہتی نہ یہ تاریکیٔ وہم و گماں برسوں
مرے آنسو ابھی تک جذب ہیں دامانِ عالم میں ٭ مرے نغموں پہ سر دھنتا رہا ہے آسماں برسوں
مجھے اے کاش کوئی پھر اسی منزل میں لے جائے ٭ بہت دیکھا کیا ہوں نکتہ چینِ بوستاں برسوں
نہ دیکھی جائے گی مجھ سے تباہی بزمِ عالم کی ٭ انہیں ہاتھوں سے کی ہے میں نے تعمیرِ جہاں برسوں
بہت ممکن ہے ہو جائے علاجِ تنگیٔ داماں ٭ سر راہے لٹائی ہے متاعِ کارواں برسوں

رکھی جاتی تو ہیں گلشن میں بنیادیں نشیمن کی
الٰہی خیر سے قایم رہے یہ آشیاں برسوں

افسانہ

ندی کنارے

از محمد ابراہیم اسرادی

بیس سال۔ دنیا اور دنیا کے ذرّہ ذرّہ میں انقلاب پیدا کر دینے والی مدت۔ کس قدر طویل عرصہ ہے۔ شہر ویران اور ویران آباد ہو چکے ہیں۔ لیکن اس ندی کی زندگی پر کچھ اثر نہ پڑا۔ یہ اسی طرح اسی شان سے بہہ رہی ہے جگہ بھی وہی —— وہ پل —— ہاں پل بھی وہی ہے لیکن اس کا سچا پجاری اب کہاں ——

وہ خواب تھا جو کچھ
کہ دیکھا جو سنا
افسانہ تھا"

اتنے دن گذر چکے .... لیکن کل جیسی بات معلوم ہوتی ہے۔ میں اسے اب بھی دیکھ رہا ہوں۔ وہ ویسے ہی نگیں —— اور افسردہ۔ ہم دونوں آخری مرتبہ یہیں ملے تھے۔ میرے لب پر آہیں تھیں اور اس کی آنکھوں میں آنسو۔ وہ ندی سے جدا نہ ہونا چاہتا تھا اور میں اس سے ——

وہ دن دور نہ تھے۔ جب دنیا کا بچہ بچہ اس سے واقف ہو جاتا۔ لیکن افسوس چاند عروج ہی میں گہنا گیا۔ وہ شاعر تھا۔ ایک بلند پایہ شاعر۔ قدرتی مناظر سے اسے عشق تھا۔ یہ ندی۔ اور یہ سبزہ زار اس کی نظموں —— اور شاعری کی محرک تھیں۔ وہ انھیں سبزہ زاروں پر گن گنایا کرتا تھا۔ چاند کی دیوی اس کے گیت سنا کرتی تھی میں ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا۔ لیکن آج تنہا ہوں۔ ہاں —— آج دنیا میں اکیلا ہوں۔ اب میرا کوئی نہیں ہے۔ نہ دوست نہ دشمن۔

اس کے آخری الفاظ اب تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ اس کے کانپتے ہونٹوں نے کہا تھا۔ "مجھے بھول نہ جانا دوست" اپنے غم نصیب دوست کو ہمیشہ یاد رکھنا۔ الوداع"

پھر وہ کچھ نہ بول سکا۔ اور نہ میں —— وہ چلا گیا۔ اور میں کھڑا تکتا رہا۔ جیسے ایک بے جان مجسمہ۔

وہ ہمیشہ کا بیمار تھا اور میں سدا کا کنگال۔ ڈاکٹروں کے کہنے سے وہ کشمیر چلا گیا اور دوستوں کے کہنے سے میں کلکتہ —— وہ کشمیر جا کر جانبر نہ ہو سکا۔ اور میں کلکتہ جا کر شرور۔

(۲)

ندی اب تک اسی طرح بڑبڑاتی چلی جا رہی ہے

لیکن اس کا سچا ہمزبان اب کہاں ۔ منوں خاک کے
نیچے دبا پڑا ہے ۔ اُس کے نہ ختم ہونے والے قصے
ختم ہو چکے ہیں ۔ " اس کا گیت " پربھو مورے پاس
بلاؤ " ، فضا میں گم ہو چکا ہے ۔ وہ اپنے پربھو کے
پاس پہنچ چکا ہے ۔

خوب یاد ہے ۔ ایک مرتبہ اُس کی بڑبڑاہٹ
نے مجھے بہت تنگ کیا تھا ۔ اس کی بیٹی ہی نے تو
کہا تھا کہ میں اس بوڑھے سے سر کھپاؤں ۔ اور وہ
اپنے روٹھے دوست کو منائے ۔

وہ بوڑھا گنپتی ایک کسان تھا ۔ اسی ندی
کنارے اس جگہ اس کا مکان تھا ۔ یہ سب زمین
اس کے زیر کاشت تھی ۔

اس کی بیوی مینا مر چکی تھی ۔ وہ اپنی بیٹی موہنی
کے ساتھ رہا کرتا تھا ۔ موہنی واقعی موہنی تھی ۔
اُس کی موہنی صورت آج بھی آنکھوں میں پھر
رہی ہے ۔

ہم دونوں دوست اکثر اس کے پاس
جاتے ۔ وہ دیکھتے ہی دوڑ آتا ۔ پھر کھٹولے
پر بیٹھ کر شکووں کا دفتر دراز کر دیتا ۔ " موہنی جوان
ہوگئی ۔ اب اس کی شادی کرنی ہے ۔ بیل بڈھے
ہوگئے ہیں ۔ ٹھیک سے جوتتے نہیں ۔ پیداوار
بھی وہ نہ رہی ۔ لگان دیکر کھانے تک کو نہیں بچتا ۔
کنیا دان دینا ہے ۔ پھر نیوتا بھی تو بانٹنا ہے ۔
سب کا کھائے بیٹھا ہوں ۔ اونہہ ۔ آبرو بھگوان
کے ہاتھ ہے ۔ سب ٹھیک کر دے گا ۔

اس کے بعد کتے کی باری آتی ۔ اسے آواز دیتا
" آؤ شبراتو " ۔ جب وہ دم ہلاتا آپہنچتا ۔ پھر
اس کے صفات شروع ہوتے ۔ " کسی زمانے میں یہ شیر
تھا ۔ مجال ہے کوئی گیدڑ نکل جائے ۔ اب بچارا بوڑھا
ہوگیا ہے ۔ پھر کھانے کو بھی تو نہیں ملتا ۔ موہنی کہتی ہے
اسے نکال دو یہ بھونکتا نہیں ۔ تم ہی غور کرو کہاں تک
بھونکے ۔ بڈھا ہوگیا ۔ میری عمر کا تو ہے غریب میں
بھی تو پہلے جیسا کام نہیں کر سکتا ۔ جوانی میں دو دو من کا بوجھ
اکیلے شہر سے لاتا تھا ۔ اب دو سیر لیکر بھی چلنا محال
ہے پھر ہنس کر کہتا " کچھ دن میں موہن بٹیا مجھے بھی
نکال دے گی ۔ " گنپتی اسی طرح بڑبڑاتا رہتا ۔ اور ہم لوگ
آگے بڑھ جاتے اُسے خبر بھی نہ ہوتی ۔ کچھ نہ کچھ کہتے
رہنا ہی اس کی زندگی تھی ـــــــ

آہ ـــــ وہ چاندنی رات ـــ اور یہ
جمنا کی ریت اب تک یاد ہے ۔ چاند اپنی پوری
بہار پر تھا اس کی کرنیں پانی پر ناچ رہی تھیں ۔
ریت کے ذرے ذرے ستارے بنے ہوئے تھے ۔

اور ہم دونوں دوست ٹہل رہے تھے ۔ وہ اپنے
اشعار گنگنا رہا تھا اور میں اس کی روانی میں بہا چلا
جا رہا تھا ۔ کہ یک بیک میرا ہمزاد دوست ٹھٹک
گیا ۔ سامنے ریت پر پرتاب اور موہنی محبت کا

گیت گا رہے تھے۔ "کیا یہ سب سچ تھا"، میرے دوست کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "ہاں گاؤں والوں کا خیال سچ نکلا"، میں نے جواب دیا تھا، "وہ ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ لیکن میرے دوست ہے"

"لیکن کیا —— محبت گناہ نہیں ہے۔ مجھے صرف اسی کی خوشی ہے کہ موہنی محبت سے واقف ہے وہ محبت کرنا جانتی ہے"، پھر اس کی آنکھوں میں آنسو تھے کہتا آسان ہے۔ اور دل اختیار سے باہر —— اُسے موہنی سے عشق تھا لیکن موہنی پرتاب کو چاہتی تھی میرے دوست نے اسے خواب سمجھنے کی کوشش کی تھی لیکن حقیقت اور خواب میں فرق ہے۔ وہ ظاہر ہو کر ہی رہی۔ پرتاب اس کے سامنے راہ کا کانٹا تھا۔ جسے وہ الگ کر سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہ کیا۔ اس نے موہنی کی پسند پر اپنی محبت قربان کر دی۔ صرف محبت ہی نہیں۔ جان اور اس کے تمام لوازمات بھی قربان کر دیئے۔ یہ تھی وہ شاندار قربانی جو اس نے قربان گاہ محبت پر دی۔ آنکھیں بند کر کے بلا کچھ سوچے اور سمجھے —— !

(۳)

کیا میں وہ دن بھول سکتا ہوں؟ جب اس ٹیلے پر میرے دوست نے مجھ سے کہا تھا۔ "رام ناتھ تم نے کچھ سنا؟" "کیا —— ؟"

"پرتاب موہنی سے خفا ہو گیا ہے۔ اُس کی نظروں میں موہنی دیوی نہیں رہی۔ اب اس پر شک کرنے لگا ہے وہ سمجھتا ہے کہ موہنی اب کسی دوسرے کو چاہتی ہے۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ غلط ہے۔ بالکل غلط۔ (موہنی اور جیسی لڑکی نہیں ہے) وہ بہت سمجھدار ہے۔ اگر اسے موقعہ ملجائے تو وہ خود ہی سمجھالے گی ——"

"کیسے موقع ملے گا اُسے۔ وہ اب باہر نکلنے نہیں پاتی۔ لوگوں کے کہنے سننے سے گنپتی نے اسے نکلنے کی ممانعت کر دی ہے۔" میں نے کہا تھا۔

"ہاں۔ ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن اگر گنپتی کہیں باہر چلا جائے۔ تو موہنی پرتاب سے مل لے گی۔ میں پرتاب کو لے کر جاؤں گا۔ تم اس کی چنتا مت کرو۔ یہ ایک پنیہ کا کاج ہے۔ کیا تم ہاتھ نہیں بٹاؤ گے"،

"ضرور۔ لیکن نہیں میں نہیں بٹا سکتا۔ مجھے دونوں سے نفرت ہے۔ وہ تم کو ——"

"خیر جانے دو۔ ایسا مت کہا کرو۔ موہنی کی خوشی میری خوشی ہے۔ محبت کا مدعا حاصل کرنا نہیں ہے۔ بلکہ خود کو کھو دینا ہے —— کس قدر بے غرض انسان تھا۔ وہ فرشتوں سے بھی بالاتر

(۴)

دوسرے روز میں گنپتی کے پاس جا رہا تھا۔ میری

لگا ہیں اچانک پرتاب پر گر گئیں۔ وہ جھونپڑی کے ایک طرف چھپا کھڑا تھا۔ موہنی بھی اسے جھانک رہی تھی۔ میرے لئے یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ یہ سب کام میرے دوست کا ہے۔ اس وقت میرے دل میں ایک نیا خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ دونوں کو گنپتی کے حوالہ کر دوں۔ پھر گنپتی بھی پرتاب سے متنفر ہو جائیگا اور میرا دوست کامیاب۔ یا میں کترا کر نکل ہی کیوں نہ جاؤں۔ نہ دونوں ملیں گے اور نہ شک دور ہوگا۔ بس یہی ٹھیک بھی تھا۔ میں واپس ہو ہی رہا تھا کہ موہنی کی آواز سنائی دی "دونا تھو بھیا۔ ذرا سنو تو!

"کیا ہے موہنی" میں نے جواب دیا۔ میرا دل خود بخود ملائم ہو چکا تھا۔

کچھ نہیں ایسے ہی بلا لیا تھا۔ ہاں یاد آ گیا۔ وہ، ہاں۔ اب آتے کیوں نہیں۔ تیا جی تو آپ کو کثر یاد کرتے ہیں۔ آہ۔ آپ کھیت کی طرف جا رہے ہونگے تیا جی کو بھی ساتھ لیتے جائیے۔ چپ پڑے رہتے ہیں ان کا بھی دل بہل جائے گا۔ میں سب کچھ سمجھ چکا تھا۔ مخالف ہوتے ہوئے موافق بن گیا۔ جا کر گنپتی کو آواز دی۔ وہ بڑبڑاتا ہوا برآمد ہوا "تم آ گئے بھیا بہت اچھا کیا۔ ہاں اتنے دن کہاں رہے۔ میں تم کو روز یاد کیا کرتا تھا۔ اور وہ تمہارے ساتھی کہاں گئے بڑے اچھے آدمی ہیں وہ۔ اور تم بھی تو اچھے آدمی ہو تم کھیت کی طرف جا رہے ہو ضرور جا رہے ہو گے

تمہارے ہاتھ میں چھتری جو ہے۔ میں بھی چلوں گا۔ آج تمہیں سب کھیت دکھا لاؤں گا۔ گنپتی کی باتوں کا جواب دینے کی کوئی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ وہ خود ہی سوال کرتا اور خود ہی جواب دیتا۔ یہی اس کی عادت تھی۔

ایک کھیت کی طرف اشارہ کر کے اس نے کہا "کیوں بھیا تم اس جگہ کو پہچانتے ہو۔ ہاں ٹھیک ہے تم بھلا کیا پہچانو گے اس وقت تم بہت چھوٹے رہے ہو گے یا پیدا ہی نہ ہوئے ہو۔ دیکھو یہ وہ جگہ ہے جہاں میرا مٹھوا گھوڑا چرا کرتا تھا۔ اس گھوڑے کی نہ پوچھو۔ بڑا تیز تھا بس یہ سمجھ لو موہنی کی ماں کے یہاں گھنٹہ میں پہنچا دیا کرتا تھا۔ لوگ اس کی چال پر تعجب کیا کرتے تھے۔ گاؤں کے زمیندار نے اسے ایک مرتبہ دیکھ لیا۔ پھر نہ پوچھو دیکھتے ہی لٹو ہو گیا لگا میری خوشامد کرنے۔ اتنے میں دیدو نہیں تو اتنے میں دیدو۔ میں اپنی جوانی میں داروغہ کو بھی خاطر میں نہ لاتا تھا۔ بھلا ان کو کیا سمجھتا۔ صاف کہدیا ستو سے ایک کوڑی کم نہ لوں گا۔ آخر جیٹھ کی پہلی یا اساڑھ کی دوسری کو بک گیا غریب۔ ٹھیک خیال نہیں جمعہ یا اتوار تھا۔ ارے نہیں منگل۔ تو بہ دو شنبہ تھا۔ اب اب حافظہ ٹھیک نہیں رہا آنا یاد ہے کوئی دن ضرور تھا۔ گنپتی کی گفتگو اسی طرح کسی نہ کسی پہلو پر شروع ہو جاتی۔ اور پھر ختم ہونے ہی نہ آتی۔ میں اپنے دل ہی دل میں اپنے دوست اور موہنی کو کوسنے دے رہا تھا کہ بیچ سے یا لاڈالدیا۔ لیکن آہ پہلے۔

پہلے جس کی باتیں زہر سے بھی زیادہ ناگوار تھیں۔
اب امرت سے بھی زیادہ شیریں معلوم ہوتی ہیں۔
جب شام کے وقت میں اپنے دوست سے
ملا۔ پہلی مرتبہ اس کا چہرہ بشاش پایا۔ لیکن حسرت وہ
تو شاید مرنے پر بھی نہ گئی ہو۔

وہ شام جب میرا دوست گنیش سے گڑگڑا
رہا تھا اور وہ صبح جب وہ پرتاب کے باپ کی خوشامد
کر رہا تھا کبھی نہ بھولوں گا۔ اُسے دونوں کو ایک کرنے
کی فکر تھی۔ اور اس نے کر دیا۔

موہنی کی شادی کے بعد جب وہ گھر واپس ہوا
اس کی حالت زیادہ خطرناک تھی پھر وہ گرتا ہی چلا گیا
ڈاکٹروں نے اُسے کشمیر بھیج دیا۔ وہ چلا گیا لیکن
پھر لوٹ کر نہ آیا۔ اب کبھی نہ آئے گا۔

(۵)

رام ناتھ بیس سال کے بعد کلکتہ سے واپس
ہوا تھا لیکن اب اس کا کوئی نہ تھا۔ صرف یہ ندی
اور ایک پل ہی رہ گئے تھے اس کے رفیق زندگی۔
وہ اس پل پر بیٹھ کر یاد ماضی کو تازہ کیا کرتا تھا۔

ایک شام ——— جبکہ وہ اپنی دھن
میں بیٹھا ہوا پرانے نقشوں کو دھرا رہا تھا کہ اچانک
ایک عورت کو دیکھ کر چونک پڑا۔ بے اختیاری
کے عالم میں اس نے سوال کیا "تم کون ہو"

"سوہنی" دوشیزہ نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"تمہارے باپ کا نام"

"پرتاب"

"پرتاب" رام ناتھ کا رنگ تیزی سے
تبدیل ہو رہا تھا۔ "موہنی کی بیٹی ——— گنیش کی نواسی۔
بالکل موہنی۔ گویا موہنی نے دوسرا جنم لیا ہے ———
لوگ خیریت سے تو ہیں بٹیا۔ تمہاری ماں تو خیریت سے
ہے۔ اور وہ۔ تمہارا باپ بھی اچھا ہے! بمبئی سے
تم لوگ کب آئے۔

"پتا جی تو سورگ باشی ہو گئے"

"سورگ باشی ہو گئے۔ رام رام رام۔ کب
بیٹی کب۔ بڑی بری خبر ہے۔ بہت بری۔"

"ایک سال ہوئے۔ یہیں تو مرے ہیں
بمبئی سے آنے کے ایک مہینہ بعد۔ چلیئے ماتا جی
سے بھی مل لیجیے۔ وہ بہت دکھی ہیں۔ اپنوں سے
ملنے کے لئے بے چین ہیں۔ آپ تو اپنے ہی معلوم
ہوتے ہیں"

رام ناتھ پر بیہوشی طاری ہو رہی تھی
وہ موہنی کی طرف چلا جیسے شرابی قدم قدم پر پیر جواب
دے رہے تھے۔

ساس یا بہو

از
جناب مرزا عبدالحمید بیگ صاحب
بی۔ اے، بی۔ ٹی (علیگ)

نومبر ۱۹۴۲ء کے رسالہ "شہاب" میں جناب مولوی مرزا رفیق بیگ صاحب کا ایک مضمون بعنوان "عینک" نظر سے گذرا۔ جس کا لب لباب یہ ہے کہ آج کل کے نوجوان شادی کے بعد بیوی کے اکسانے اور ورغلانے سے اپنے گھر سے بیگانہ اور سسرال پر فریفتہ ہو جاتے ہیں۔ مرزا صاحب نے اپنے مضمون میں نوجوانوں کے اس طرز عمل کی بالکلیہ ذمہ داری بیوی پر عاید کی ہے۔ مضمون کا موضوع تو واقعی بہت دلچسپ ہے۔ مگر معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مرزا صاحب نے ازدواجی زندگی پر سطحی نظر ڈالکر ایک خاص نتیجہ اخذ کر لیا لیکن اس کے اہم اور موثر عناصر پر یا تو انھوں نے سنجیدگی کے ساتھ غور کرنیکی فکر ہی نہیں کی اور یا ممکن ہے کہ ذہن نے رسائی ہی نہ کی ہو بہرکیف تصویر نامکمل رہ گئی۔ فطرت انسانی کا خاصہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ہر چیز کو اپنے منشا کے بموجب دیکھنا چاہتا ہے اور اس کے جواز میں دنیا بھر کے دلائل پیش کر دیتا ہے۔ تعصب کی عینک اس کو کسی شے کی حقیقت ظاہر نہیں ہونے دیتی ہے۔ خیر جو کچھ بھی ہو مرزا صاحب کی "عینک" پڑھنے کے بعد ہماری نظر میں تو اس اناڑی مجسٹریٹ کی تصویر پھر گئی جو روئداد مثل کو سمجھے بغیر ایک ٹپس ٹپسا فیصلہ لکھ مارتا ہے اور بزعم خود پھولا نہیں سماتا کہ اس نے نایاب فیصلہ لکھا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ شادی سے پہلے مرزا صاحب سمپل لینز ( ) کی عینک استعمال کرنے کے عادی تھے۔ شادی کے بعد وہ نمبر اتر گیا اور کمپاؤنڈ لینز ( ) کی عینک کی ضرورت لاحق ہو گئی۔ مگر خدا بھلا کرے خود رائی کا۔ مرزا صاحب نے اس چیز کو اپنی کسر شان سمجھا کہ اس بارہ میں ہم جیسے ماہر فن سے مشورہ کر لیتے۔ وہ اسی مغالطہ میں رہے کہ اب بھی پرانی عینک کام دیتی رہے گی درآنحالیکہ زاویہ نگاہ بدل چکا تھا۔ یہ سچ ہے کہ ہر چیز ان کو نظر تو ضرور آتی رہی مگر اس کے اصلی رنگ و روپ میں نہیں۔ اور مرزا صاحب اسی غلط فہمی میں رہے کہ وہ ہر چیز کو اس کے اصلی رنگ میں دیکھ رہے ہیں۔ لیکن اس بارہ میں ہم ان کو بھی ذرا مجبور ہی پاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ مرزا صاحب ہیں کوئی پچاس کے لگ بھگ اور یہ ظاہر ہے کہ انیسویں صدی کا چوکھٹا بیسویں صدی کی تصویر کے لئے مشکل موزوں ہو سکتا ہے۔ مرزا صاحب نے جس زمانہ میں آنکھ کھولی اور پرورش پائی وہ موجودہ زمانہ سے بالکل مختلف تھا اس زمانہ کی تہذیب تمدن اور

معاشرت کے لحاظ سے جو خیالات جذبات اور میلانات مرزا صاحب کی طبیعت میں داخل ہو چکے تھے وہ زمانہ حال کے رنگ سے کسی طرح بھی میل نہیں کھا سکتے۔ لہذا اگر کوئی شخص آج کل کے واقعات اور حالات کو ستر سال قبل کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کرے گا تو اس کو بجز مایوسی کے اور کچھ نظر نہ آئے گا۔ اس کی موٹی سی مثال یوں سمجھیئے کہ پرانی وضع قطع کا کوئی پچاس سالہ بڈھا جس کے بال سفید۔ دانت گرے ہوئے اور قویٰ مضمحل ہوں اگر آج کل نوجوانوں کی اپ ٹو ڈیٹ ڈنر پارٹی میں شریک ہو اور اپنے خیالات اور میلانات کے اعتبار سے نوجوان کی اندھی تقلید کا مذاق اڑانے لگے تو ظاہر ہے کہ نوجوان اس کے دقیانوسی خیالات کا مضحکہ اڑائیں گے۔ خیر ہم کو اس موقع پر قدیم اور جدید تمدن و معاشرت کا مقابلہ کر کے ان کے حسن و قبح پر بحث کرنی مقصود نہیں ہے۔ صرف اس قدر عرض کرنا ہے کہ ہمارے محترم مرزا صاحب یہ محسوس کر لیں کہ زمانہ بدل چکا ہے اس لیئے زمانہ حال کے واقعات کو جانچنے کے لیئے زاویہ نگاہ میں تبدیلی کرنی ضروری ہے۔

الغرض مضمون پڑھنے کے بعد ہم نے بھی اپنے حالات پر نظر دوڑائی تو معلوم ہوا کہ نتیجہ تو واحد ہی مگر اسباب و علل کا اختلاف ہے اس لیئے خیال پیدا ہوا کہ لاؤ ہم بھی اپنی ازدواجی زندگی کا جائزہ لے ڈالیں تاکہ مرزا صاحب کی غلط نمبر کی عینک کی وجہ سے تصویر کا جو دوسرا رخ بیں پردہ رہ گیا ہے۔ وہ منظر عام پر آجائے۔ اور قارئین کو صحیح طور پر کوئی نتیجہ اخذ کرنے میں مدد ملے۔ دل میں یہ خیال آنا ہی تھا کہ جذبات کا ایک تلاطم امنڈ آیا۔ یعنے جذبہ احترام اور جذبہ صداقت میں ایک زبردست ذہنی کش مکش شروع ہوگئی۔ ایک طرف جذبۂ احترام کہتا کہ خبردار والدہ کے خلاف ہرگز زبان نہ کھولنا۔ یہ ان کی تکلیف اور روحانی اذیت کا باعث ہوگا۔ "خطائے بزرگاں گرفتن خطا ست" لیکن دوسری طرف جذبۂ حق و صداقت آواز لگاتا کہ دیکھو اعلائے حق کو دبانا حد درجہ کی بزدلی ہوگی۔ تم تعلیم یافتہ ہو تعلیم کے معنے کردار کے ہیں اور کردار کا تقاضا ہے کہ حق و باطل کو صاف صاف بیان کر دیا جائے۔ عرصہ دراز تک یہی رسّہ کشی جاری رہی۔ بالآخر کردار کی فتح ہوئی اور ہم نے ارادہ کر لیا کہ تمام واقعات بلا کم و کاست سپرد قلم کر دیئے جائیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس قسم کی ذہنی کش مکش ہمارے مرزا صاحب موصوف کے دماغ میں بھی ہوئی یا نہیں۔ قرینہ یہ ہے کہ ہوئی ہوگی اور ضرور ہوئی ہوگی۔ لیکن فتح جذبہ احترام کو ہوئی ہوگی۔

لیکن ازدواجی زندگی کا جائزہ لینے سے قبل یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اپنے یہاں کے سماج پر

ایک طائرانہ نظر ڈال لی جائے تاکہ میاں اور بیوی اور ان کے متعلقین کا موقف سمجھ میں آجائے۔ موجودہ تہذیب اور معاشرت کے باوجود ہمارے ہاں بالعموم لڑکی کو تعلیم اس غرض سے نہیں دلائی جاتی کہ وہ فن دان ہوکر روزی کی حد تک بے نیاز ہو جائے اور شوہر کی دست نگر نہ رہے اور نہ ہمارے ہاں ولایت کی طرح کوئی ایسا قانون قاعدہ ہے جس کی رو سے لڑکی کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ میاں سے ناراضی کی صورت میں عدالت میں جاکر میاں کو با آسانی طلاق دے دے اور اپنی گلو خلاصی کرلے۔ اس معاشی و تمدنی نقطۂ نظر کے قطع نظر ہمارے ہاں کی قدیم روایت کے بموجب عورت مرد کو اپنے لئے ایک قابل پرستش ہستی تصور کرتی ہے اور رضا و دلجوئی کو اپنا فرض عین خیال کرتی ہے۔ گو اس میں شک نہیں کہ موجودہ تمدن اور تعلیم کے اثر سے عورتوں نے مردوں کے ناروا سلوک کو محسوس کرنا شروع کر دیا ہے اور مردوں کے خلاف ان کے دل میں کچھ بغاوت کے سے آثار نمودار ہو چلے ہیں۔ مگر پھر بھی بحیثیت مجموعی عورت کی اس خاصیت میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہوا ہے۔

غرض یہ کہ لڑکی اور لڑکی والوں کا پوزیشن بہت کم زور ہوتا ہے اور وہ حق و ناحق لڑکے والوں کے ناز و نخرے برداشت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ دولہا میاں روٹھ جائیں اور لڑکی کو گھر بیٹھنے کی نوبت آجائے۔ لڑکا اور لڑکے والے فریق ثانی کی اس پوزیشن سے بہت بے جا اور ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ وہ خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ لڑکی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی وہ مجبور محض ہے اور ان کے رحم و کرم پر ہے۔ وہ جس طرح چاہیں اس کو رکھیں اور جو ظلم و ستم چاہیں اس پر ڈھائیں اس کی مجال نہیں کہ اُف کرے۔ ہم کو اپنی فضیلت اور برتری کا احساس ضرور ہے بلکہ ضرورت سے زیادہ نمایاں ہے لیکن جس بے دردی کے ساتھ ہم اپنی شریک حیات کے حقوق کو پامال کرتے ہیں اس کا احساس بھول کر بھی نہیں ہوتا۔ ہم گھر کی دیوی کی پاک و سچی محبت کو ٹھکراتے ہیں اور ناجائز محبت سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور اس کو شان مردانگی تصور کرتے ہیں۔ ہم اپنی مونس و غمگسار کے جذبات اور احساسات کا مطلق لحاظ نہیں کرتے اس کے جذبۂ خودداری اور عزت نفس کو پائمال کرتے ہیں اس سے سیدھے منہ بات نہیں کرتے اور اس کو افضلیت کی دلیل بناتے ہیں۔ ہم دوست احباب کے ساتھ ناچ و رنگ کی محفلوں میں حصہ لیتے ہیں رات دن رنگ رلیاں منانے کو اپنا فطری حق سمجھتے ہیں۔ لیکن ہم کو یہ خیال نہیں آتا کہ گھر والی ضروریات زندگی کے لئے ترستی رہتی ہے۔ الغرض

ہم اپنی گھریلو زندگی کے لطف سے نا آشنا اور بیوی بچوں
کے درد اور دلجوئی سے بے بہرہ ہیں۔ ہم نے بیوی کو صرف
آلہ تفریح بنا رکھا ہے۔ اس سے زیادہ اس کی اور کوئی
حیثیت نہیں۔ غرض ہم نے اس سے وہ سب قدر و منزلت
چھین لی ہے جو اسلام نے اس کو عطا کی تھی۔ ہم کو اس
سے انکار نہیں کہ عورت میں کمزوریاں خامیاں اور
برائیاں موجود ہیں اور ان کی اصلاح کا طریقہ یہ نہیں ہو سکتا
کہ ہم عورتوں کو کم عقل اور جاہل سمجھ کر ان سے غافل
ہو جائیں اور ان کی طرف توجہ نہ کریں۔

یہ تو ازدواجی زندگی کا ایک پہلو تھا۔ اب ذرا
دوسرا پہلو بھی ملاحظہ فرمایئے۔ اس کو فطرت کی
ستم ظریفی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ایک طرف
تو عورت، مرد کے بیجا اور ناروا سلوک کی شکایت
کرتی ہے دوسری طرف وہی بے جا اور ناروا سلوک
اپنی بہو اور بھاوج کے لئے روا رکھتی ہے۔ ہم یہ تو
نہیں بتا سکتے کہ ساس و بہو اور نندوں و بھاوج کے
جو تعلقات آج دیکھنے میں آتے ہیں ان کی ابتدا کب
اور کیوں کر ہوئی ہوم میکنگ سائنس پڑھنے والی کسی
بہن کے لئے اس میدان میں ریسرچ کا اچھا موقع
ہے ہم صرف اس قدر یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ
یہ تعلقات نوے فیصدی ناخوش گوار اور کشیدہ
رہتے ہیں معلوم نہیں کس قانون و قاعدہ کی رو سے
ساس اور نند کو یہ حق حاصل ہو گیا ہے کہ وہ بہو بھاوج

کو جا و بیجا طور پر دبا کر رکھ سکتی ہیں اور پھر اس حق کا
استعمال اس بری طرح کیا جاتا ہے کہ زندگی کا سارا
مزہ خراب ہو جاتا ہے یہی وہ عنصر ہے جو ازدواجی
زندگی میں سب سے زیادہ موثر اور کارگر ہوتا ہے۔
لیکن بدقسمتی سے یہی عنصر ہمارے محترم مرزا صاحب
کی نظر سے پوشیدہ رہ گیا۔ جس کی وجہ سے وہ تصویر
کا دوسرا رخ نہ دیکھ سکے۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد اب ہم اپنی ازدواجی
زندگی کا جائزہ لینا شروع کرتے ہیں۔ اس وقت جب
ہم نے اپنی زندگی کی مختلف منزلوں پر نظر دوڑائی
تو ہم محسوس کر کے تکلیف ہونے لگی کہ ابتدائی ہر
اسٹیج پر ہم کو دب کر ہی رہنا پڑا۔ بچپن میں والدین
حضرات نے ہمیشہ ڈانٹ ڈپٹ کر رکھا مدرسہ
میں گئے تو ماسٹر صاحب نے وہ رعب گانٹھا کہ بس
خدا کی پناہ۔ میاں اس سے بڑھ کر اور کیا ظلم ہوگا
کہ (It is better to rule
by love than fear.)
جیسا مضمون ڈنڈے کے زور سے ہمارے دماغ میں اتارا جاتا
تھا۔ لیکن خیر جب اللہ اللہ کر کے کالج پہنچے تو ذرا آزادی
کا سانس لینے کا موقع ملا اور ہم نے سب سے پہلی مرتبہ
یہ محسوس کیا کہ ہم آزاد ہیں اور ہماری شخصیت اور
انفرادیت ایسی شئے ہے کہ اس کو ابھارا جانا چاہیئے
ہم کو اس کا اعتراف ہے کہ کالج کی زندگی میں ہم کو

شخصیت اور انفرادیت کے استعمال کا بہت کافی
موقع ملا بلکہ بعض اوقات تو ہم نے اس کا استعمال
اس بری طرح کیا کہ بیچارے پروفیسر بھی پچھتاتے ہونگے
کہ ان کو ناحق یہ سبق پڑھایا۔ لیکن کالج سے فارغ ہونے
کے بعد حقیقی زندگی میں داخل ہوتے ہی ہم کو مجبوراً محسوس
کرنا پڑا کہ ہم جہاں تھے وہیں ہیں۔ انفرادیت اور
شخصیت کا سبق حاصل کرنے کے بعد ہم نہایت
شان سے یہ خیال کرتے تھے کہ بس ہم بھی اب ہر
چیز میں اپنی شخصیت کو کام میں لائیں گے۔ یعنے
شادی بھی اپنی مرضی کے موافق کسی لڑکی سے کریں گے۔
لیکن جناب یقین مانیے دنیا میں قدم رکھنے کے ساتھ
ہی ہم نے بڑی طرح سے محسوس کیا کہ ہمارے والدین
حضرات ہمارے پروفیسروں کے بھی استاد ہیں
کہاں کی شخصیت اور کہاں کی انفرادیت اودھوں نے
اپنی مرضی اور پسند سے ہمارے لئے ایک شریک
حیات کا انتخاب کر دیا اور ہمارے لئے بجز اس کے
چارہ نہیں تھا کہ سر تسلیم خم کر دیں۔ گو ہم کو اس کا
اعتراف ہے کہ ہماری خوش قسمتی سے یہ انتخاب
برا نہ تہا۔ لیکن ہاں شخصیت اور انفرادیت کی یہ
پہلی کھلی ہوئی شکست تھی جس نے ہمارے خدائی خود
داری کو ٹھیس لگائی۔ بہرکیف ہم متاہل ہو گئے
اور ہماری والدہ محترمہ کے گھر میں بہو آگئی۔ تھوڑے
دن تک تو بہت آرام و چین سے گذری۔ دلہن
کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔ ساس و نندوں نے خاطر و
مدارات میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی مگر تھوڑے عرصہ
بعد ہی اس مصنوعی خاطر و تواضع کی سب قلعی اتر
گئی اور ساس کا رشتہ اپنے اصلی رنگ میں جھلکنا
شروع ہو گیا۔

ہماری والدہ محترمہ نے اپنی بہو کے انتخاب کے
وقت دلہن والوں کے تمدن اور طرز معاشرت
کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا اور اس کی وجہ صاف
ظاہر ہے کہ بحیثیت ساس کے ان کو یہ اچھی طرح
معلوم تھا کہ بہو کو یہ حق ہرگز حاصل نہیں ہے کہ وہ
سسرال میں آکر اپنی مرضی یا اپنے گھر والوں کی طرز
معاشرت برقرار رکھے۔ اس پر سسرال کے آئین و
قوانین کی پابندی لازمی ہے۔ بس ہمارے گھر کی
بسم اللہ یہیں سے غلط ہوئی یعنے ہماری بیوی زمانہ
حال کے رواج کے مطابق ساری باندھنے کی عادی
تھیں اور سچ پوچھو تو ہم کو بھی یہی لباس سب سے زیادہ
پسند ہے مگر ہماری والدہ صاحبہ کو اپنے زمانے کے
لحاظ سے اس لباس سے نفرت تھی۔ اماں جان
کی آنکھ دیکھنے کے بعد بھلا بہو کی کیا مجال تھی کہ اس
قاعدہ کی خلاف ورزی کرتی۔ ہم دل ہی دل میں تاہم
خون ہوتے کہ آخر یہ کیا ظلم ہے کہ عورت لباس بھی
اپنی مرضی اور ہمارے پسند کے مطابق نہ پہنے۔ مگر حق شناس
ادب اور احترام نے اس کالج والے احساس شخصیت کو

اس بری طرح دبایا تھا کہ اس کو ابھرنے کی ہمت ہی نہ ہوتی تھی۔ خیر صاحب تھوڑا زمانہ اس طرح گذر گیا۔ عید کا موقع آیا۔ ہم نے ایک اچھی سی ساری لاکر بیوی کے حوالے کی کہ عید کو باندھیں۔ انھوں نے ازراہ سعادت مندی اس کو لیجا کر ساس صاحبہ کے سامنے رکھدیا بس اس ساری کا دیکھنا تھا کہ ایک قیامت بپا ہوگئی۔ بہو کی وہ فضیحتیاں ہوئیں کہ الامان الحفیظ۔ ساس صاحبہ نے تیور میں بل ڈال کر قہر آلود نگاہوں سے بہو کو دیکھا اور فرمانے لگیں۔

"یہ بازاری اور ناچنے والی عورتوں کا لباس تمہارے گھر والوں ہی کو مبارک ہو ہمارے گھرانے میں شریف بہو بیٹیاں ایسی بے شرمی اور بےحیائی کا لباس نہیں پہنتیں میرے جلانے کے لئے میاں سے فرمایش کرکے یہ ساری منگائی گئی ہے ٹھہرو میں بھی اس کا مزہ چکھاتی ہوں"

یہ کہہ کر ساس صاحبہ نے قینچی ہاتھ میں لی اور نہ صرف اس نئی ساری کا بالکل اور جتنی ساریاں تھیں ان سب کے ڈوپٹے بنا ڈالے۔ ہم بھی دم نہ مار سکے مگر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے رہے کہ اوّل تو بیوی کے سامنے ہماری عزت نفس مجروح ہوئی دوسرے بیوی بیچاری پر بلا وجہ کی ڈانٹ پڑی۔ ذمہ داری بیٹے کی مگر لعن وطعن کی بوچھاڑ ہوئی غریب بہو پر۔ بہو بیچاری آب دیدہ ہوکر اپنے کمرہ میں چلی آئی اور ہم غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے گھر سے باہر چلے گئے۔

(باقی)

(بقیہ اداریہ)

علاوہ ازیں چاند کھلنا کوئی محاورہ نہیں ہے چاند کھلنا گو عام محاورہ نہیں ہے مگر شاعر کا استعمال اردو کو بقول آپ کے داغدار نہیں کرسکتا۔ اور نہ یہ محاورہ ناموزوں ہوسکتا ہے کیونکہ چاند کا ستاروں کے جھرمٹ میں کھلنا کوئی غلط محاورہ نہیں ہے۔

دوسرے مصرعہ میں "تبسم سے انمول موتی لٹا دے"۔ تبسم کے موتی لٹانا۔ چہ معنی دارد؟ اگر تبسم سے پھول جھڑنے یا لٹانے کا محاورہ صحیح ہے اور دامن ادب اس سے گندہ نہیں ہوتا تو ہمارے خیال میں یہ بھی صحیح ہے۔ تخیل میں ذرا زیادہ لطافت ہے۔ تیسرا مصرعہ "زمیں کو حسین بنا دے"، کیا زمین حسین تھی جو آپ اس کو اس سے زیادہ حسین بنانے کے متعلق کہا جارہا ہے۔ یہ خیال نہ صرف نیا بلکہ مضحکہ خیز بھی ہے۔

حسن کی تعریف کیا ہے۔ ناقد صاحب نے اس کو نظر انداز کردیا ہے۔ جو شے کسی اضافے سے دلکش، دلآویز، پرکیف، سرور آور، ہوسکتی ہے۔ وہ حسین بھی ہوسکتی ہے۔ اور بنائی جاسکتی ہے یہ خیال نیا نہیں ہے بلکہ بہت پرانا ہے۔

چھٹا مصرعہ وزن سے گر رہا ہے۔ جوانی کی مستیوں کو صدا دے سے مراد ہے۔ یہ چیز کم از کم اہل ذوق کی سمجھ سے باہر معلوم معلوم ہوتی ہے۔ اگر پورا شعر ہوتا تو مطلب واضح ہوجاتا۔ ہوسکتا ہے کہ شاعر نے کسی کی آنے والی جوانی کو مخاطب کے لئے کہا ہو شاعرانہ جدت سے گریز غلطی ہے۔ اور فدن کی بحث معرا کی نظم میں کیوں بار بار آئی ہے۔ جبکہ ناقد اور شاعر دونوں کو اس سے گریز ہے اس کے علاوہ "ترنم کے دریا بہا رہے ہے"، "دامنی کی وسعت میں کہانی بکھیری ہوئی"، "بہیری ہوئی آرزو کا

طوفان" ان پر تنقید لاحاصل ہے۔ ادبا رنے خصوصاً افسانہ نویس حضرات نے اکثر مقامات پر ان محاوروں کو استعمال کیا ہے اور پھر کسی قسم کی کثافت بھی تو ان میں نہیں ہے آگے لکھتے ہیں: ناشاد ہندی صاحب۔

مختصر یہ کہ "ہندستانی ادب" میں سردار الہام جیسے شاعر کی ایسی بے تکی اور سپٹ نظم دیکھ کر ہمیں رسالہ مذکور کے ایڈیٹر صاحب کے ذوق شاعری کی داد دینی پڑتی ہے۔ اور سخت حیرت ہے کہ کم از کم میری رائے ہے کہ آپ سردار الہام صاحب یا اس قسم کے دیگر سپٹ شاعر کی ایسی نا کارہ چیزیں ایڈیٹر صاحبان کیوں شائع کرتے ہیں۔ اس کا تصفیہ میں آپ قارئین پر چھوڑتا ہوں۔

غالباً یہ بھی ایک تنقیدی پہلو ہے۔ ناشاد صاحب نے اگر فن کے دائرے میں رہ کر تنقید کی ہوتی تو ہم بھی ان کی اس اشک شوئی میں ضرور حصہ لیتے ان کا یہ اعتراض صحیح ہے اردو ادب میں بہت سی خامیاں ہیں خصوصاً جو خیر انشا پردازوں ہیں۔ مگر ناقد کا جھنجلاہٹ میں وہ کچھ کہہ دینا جو ذاتی عنادی عناصر کو نمایاں کر دے ہمارے خیال میں ناقد کو اس کے بلند مقام سے گرا دیتا ہے اگر ناقد صاحب نے عروض کی کسوٹی پر نظم کو پرکھ کر اس کے حسن و قبح پر بحث اور اغلاط کے اسباب کا اظہار کرتے ہوئے تدارک کی کوئی سبیل پیدا کر دی ہوتی تو ہمیں ان پر ان کی تنقید پر اعتراض نہ کرنا پڑتا۔ اگر تنقید۔ تنقید ہوتی تو ہمارے خیال میں "ہندستانی ادب" کے قابل مدیر کو اعتراف کرنے میں کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ مگر اس وقت کیسے ممکن ہو جبکہ ناقد صاحب کی تنقید خود قابل تنقید بن گئی ہے اور انھوں نے بجائے تنقید کرنے اور اغلاط کو سلجھانے کے الجھن کو مزید الجھن میں ڈال دیا ہے۔

(۲)

ایک سیٹھ جی کے پاس ہمارے ایک کرمفرما تشریف لے گئے سیٹھ جی سے انھوں نے کہا کہ آپ اتنے بڑے آدمی ہیں۔ اتنا روپیہ خرچ کرتے ہیں آپ کو ادب کی سرپرستی بھی فرمانا چاہیئے اردو ادب کی ترقی آپ متمول اصحاب کے اشتراک کی متمنی ہے "ارم" چار سال سے ادب کی خدمت کر رہا ہے۔ کم از کم آپ اسے ہی ایک سال کے لئے جاری کرا لیجئے اسی کو آپ کا اشتراک غالب تصور کیا جائیگا۔

سیٹھ جی نے پانچ منٹ تک غور کیا اس کے بعد ارشاد فرمایا "آپ نے ساقی کو دیکھا ہے۔ یا ادب لطیف کو تو ضرور دیکھا ہی ہوگا ابھی دہی ماجو لاہور سے نکلتے ہیں ان میں کا ایک شاید ――― کونسا دہلی سے نکلتا ہے۔ واہ میاں کیا کہوں مضامین تو ان مجھے پسند آئے جو باتیں ہوتی ہیں سچی اور بچی تلی ہوئیں ――― اور ان کا معیار۔ یہاں کا کوئی پرچہ مقابلہ نہیں کر سکتا ――― معیار کی بلندی ہی پڑھنے والے کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ دیکھئے نا۔ ارم میرے پاس متواتر ایک سال سے آ رہا ہے۔ میں نے تقریباً آٹھ مہینے سے اسے دیکھا تک نہیں۔ دیکھو جی میاں میرا یہ مشورہ اڈیٹر کے کان میں ڈالنا کہ ادب لطیف جیسے مضامین دیا کریں ――― اس کے جواب میں ہمارے ارم پرور حضرت نے عرض کیا۔ معیار کے لئے تو ہم سر توڑ کوشش کر رہے ہیں۔ آپ کا پیغام میں ایڈیٹر صاحب تک پہنچا دونگا۔ فی الحال آپ اس کی سرپرستی قبول فرما لیجئے سیٹھ جی نے کہا ابھی میری اکیلے کی سرپرستی کیا کرے گی۔؟ نا میاں فی الوقت اسے بند کر دیجئے۔ یوں تو ہماری بہترین توقعات ارم سے وابستہ ہیں۔

سیٹھ جی آپ کا پیغام ہم تک پہنچا۔ ارم کا معیار آپ کے فرمانے کے مطابق ادب لطیف، ساقی جیسا بنانے کے لئے ہم کوشاں ہیں اور کوشش کریں گے لیکن ادب لطیف میں شایع ہونیوالے ان افسانوں کے معیار کا کیا ہوگا۔ جن میں، مزدور اور روٹی۔ روٹی اور مزدور کی رٹ ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ آپ جانیں کیا کیا ہوتا ہے۔ ہمیں تو صرف الفاظ یاد ہیں۔ سوشلیزم، کمیونیزم، فیسزم وغیرہ۔ ہاں! آپ جانتے بھی ہوں گے سب سے زیادہ ـــ کیونکہ جانتے ہوں گے بھلا ـــ ایک ہزار مزدور اور آپکا اکیلا دماغ۔

اُف - ہمارا دماغ تو تصور سے ہی پریشان ہوا جارہا ہے ـــ اچھا پریشانی کی تو بات ہی ہے ـــ دو والے سے تین اور پندرہ والے سے پچہتر حاصل کرنا کیا معمولی دماغ کا کام ہے اور پھر مزدور اور روٹی ـــ یا روٹی یا مزدور کے جملے کس قدر بلند معیار رکھتے ہیں یہ تو آپ جیسے بلند معیار رکھنے والے ہی جانیں اور ہمیں اس معیار سے باخبر کریں۔ آپ ہیں تو عقل کل ــــــ ذرا ہمارے اُلجھے ہوئے مسئلے کو لگے ہاتھ حل کر ڈالئے ـــ سیٹھ اور مزدور ــــــ مزدور اور سیٹھ ـ سوشلیزم ـ سیٹھ مزدور ـ ان کو اگر جمع کیا جائے تو حاصل کیا رہے گا۔

ادارے کا ایک رکن

فریبِ نگاہ

از۔ ریاض جنیدی　　(عثمانیہ)

حسین منظر کی رنگینی تبسم ریز ہوتی ہے
جھلک اس کی تصور میں مسرت خیز ہوتی ہے
مرے ذوقِ نظر میں دائمی ہنگامہ برپا ہے
فریبِ رنگ مستی ان نگاہوں کا تماشا ہے
ہنسی کھلتی دلِ حساس کی کشتی کنارے پر ؛
بہا کرتی ہے ہر دم حسن کے دریا کے دھارے پر
اسی ذوقِ نظر نے مجھ کو پہنچایا وہاں اک دن
اسی ٹیلہ پہ جس جا قالبِ ہمیوں ہے ساکن
سہانا وقت تھا اک شام کا چھائی ہوئی تھی رنگینی ؛
تصور میں تھی رقصاں طور کے جلووں کی بےچینی
ترانے شوق کے گاتے تھے طائر آشیانوں میں
کہیں سرگوشیاں کرتے تھے انجم آسمانوں میں
سمٹ آیا تھا ہر ذرہ میں حسنِ یوسفِ کنعاں ؛
لطافت حسن رنگینی نشاط و عیش کا ساماں
نگاہیں جم گئیں میری افق کی لالہ کاری پر ؛
حجابِ احمریں نو عروسِ آسمانی پر ؛
عمارات فلک پیما نظر آتے تھے برسوں سے
گھروندے جیسے مٹی کے ہوں ننھے ننھے بچوں کے
حسین منظر کی رنگینی تبسم ریز ہوتی ہے
جھلک اس کی تصور میں مسرت خیز ہوتی ہے

نظامِ نو

از ــ مولانا عبد القادر صاحب

یورپ کے سیاسی مدبروں نے مانی کے عقیدے "ثنویت روح و مادہ" کو ایک ایسے عقیدے کی حیثیت سے قبول کر لیا جس میں کسی شک و شبہہ کی گنجایش نہ ہو تو یورپ یہ سمجھ بیٹھا کہ مذہب ہر فرد کا نجی معاملہ ہے اور انسان کی دنیوی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اور روح و مادہ کی یہ غلط تفریق یورپ مذہبی و سیاسی افکار پر اس نہج سے اثر انداز ہوئی کہ اس نے یورپ کے نظام حکومت سے مسیحیت کو قریب قریب خارج کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کلیسائی نظام کی وجہ سے جو یورپ کی رہی سہی سیاسی وحدت تھی ایسی کثرت میں تبدیل ہو گئی۔ جس کے مختلف اجزاء میں کوئی باہمی ہم آہنگی نہ تھی۔ انسانیت کا ہمہ گیر تصور قومیت کے تنگ دائرہ میں گھر کر رہ گیا۔ ویانا کانگریس ۱۸۱۵ء کا علانیہ یہ مقصد تھا کہ یورپ کو قوموں کے اعتبار سے مملکت میں تقسیم کرے۔ ۱۸۷۰ء میں قومی مملکت عروج پر پہنچ گئی اور یورپ ایسی بے جوڑ مملکتوں کا مجموعہ بن کر رہ گیا جن کے سر میں انسانیت کا سودا نہیں بلکہ ان پر قومیت کا بھوت سوار ہے۔ قومیت کے جذبہ نے یہاں تک ترقی کی کہ انسانیت کا جذبہ اس کے نیچے پس کر خاک ہو گیا۔ یورپ کی قوم دوسری قوم کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگی اور اس کے ساتھ معاشی رقابت شروع ہوئی۔ ہر قوم نے مشرق میں تجارتی منڈیوں پر قابض ہونے کی کوشش شروع کی۔ ہر قوم کی معاشی ہوس متقاضی ہوئی کہ اسی کا اقتدار ساری دنیا پر ہو۔ مال و دولت کی ہوس کی آگ انسانوں کے دلوں پر بھڑکی اور اس قدر پھیلی کہ اس نے ساری دنیا کے خرمن امن کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ اسی معاشی قومی رقابت کے جذبے نے باہمی عداوتوں کو یہاں تک ترقی دی کہ جنگ کے شعلے ۱۹۱۴ء میں پہلے آہستہ آہستہ اٹھنے لگے اور بالآخر اس قدر بلند ہوئے کہ ساری دنیا پر پھیل گئے اور ایک "جنگ عظیم" برپا ہوئی اس کے بعد ۱۹۴۰ء کی عالمگیر جنگ پہلی سے بہت بڑھ کر خطرناک شروع ہوئی جو آج دنیا کو بھسم کر رہی ہے۔ آج جبکہ اقوام انسانی خون سے ہولی کھیلنے میں مصروف ہیں۔ مغربی دنیا کے ہر گوشہ اور ملک سے یہ آواز اٹھ رہی ہے جو کرۂ زمین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک فضائے آسمانی میں گونج رہی ہے کہ

"اس دنیا کو ایک نئے نظام کی ضرورت ہے"

جو دنیا کے لئے بہتر ہو۔

قابل غور بات یہ ہے کہ بہتر نظام کس طرح پیدا ہوگا اور کون پیدا کرے گا؟ مادہ پرستوں کے خیالات مادہ ہی کی طرف جاتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ مختلف قوموں کی کوئی کانفرنس صلح و اخوت اور باہم محبت کا ایک نیا نظام
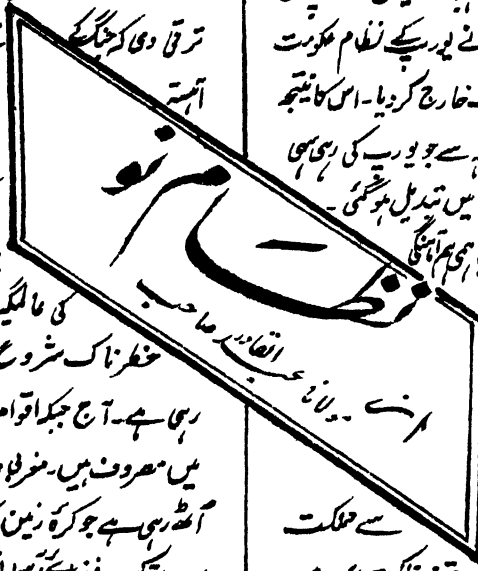
بنانے میں کامیاب ہو جائیگی جو عدل اور انصاف پر مبنی ہوگا جس میں ظلم و استبداد کی گنجائش نہ ہوگی۔ یہ محض خواب و خیال ہے قوموں کے نمایندے انہی قوموں میں سے ہوں گے اور ان ہی قوموں کی ذہنیت ان کے اندر بھی ہوگی کہ ہر ایک قوم اپنے اقتدار کو بڑھانے کے لئے دوسری قوم کو مٹائے یا کمزور کرے ایک فریق کے جنگ میں غالب آ جانے سے اور دوسرے کے کلی طور پر مغلوب ہو جانے سے حالات بہت کچھ بدل سکتے ہیں۔ مگر اپنے غلبہ اور اقتدار کی ذہنیت نہ بدلے گی فاتح اقوام جو مفتوح اقوام کے ہاتھ سے اپنے خوشنما شہر کو کھنڈر بنا ہوا دیکھیں گی۔ اور اپنے فرزندوں کی ہلاکت اور اپنے بچوں کی بربادی سے ان کے سینے کھول رہے ہوں گے۔ کیا فتح کے ساتھ ان کی یہ ذہنیت ہو جائے گی؟ اب ہم ان کو اپنا محسن سمجھ کر ان کے ساتھ محبت کی بنیاد پر ایک نظام قائم کریں یا وہ ان کی قوت کو کلی طور پر توڑنے کی کوشش کریں گے؟ کہ وہ دوبارہ سر اٹھا کر دنیا کے امن کو خلل میں ڈال دیں ظاہر ہے کہ ان اقوام کے ایک حصہ کی فتح کے ساتھ نقصانات کے انتقام لینے کا جذبہ جو مفتوحین کے ہاتھ سے پہنچ چکے ہوں گے ایک آگ کی طرح سینہ میں مشتعل ہوگا اور مفتوحین کے سینے میں اس انتقام کی چنگاریاں سلگ رہی ہوں گی کہ پھر وہ کب اپنے فاتحین سے شکست کا بدلہ لیں۔ یونان کے مشہور مقنن سولن کا یہ قول کسے یاد نہیں کہ "معاہدہ مکڑی کا جالا ہے جو اپنے سے کمزور کو پھنسا لیتا ہے لیکن اپنے سے طاقتور کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا"

کیا ہمارے سامنے ۱۹۱۴ء کی جنگ کا نقشہ نہیں؟ کہ کس طرح ایک جنگ عظیم پانچ سال تک جاری رہی۔ اور کس طرح شہر اور گاؤں ویران بن گئے۔ لاکھوں انسان موت کے گھاٹ اتارے گئے۔ لاکھوں کی زندگیاں ایک دائمی دکھ او مصیبت میں تبدیل ہو گئیں۔ پھر ایک فریق غالب آیا اور دوسرا کلی طور پر مغلوب ہو گیا۔ پھر انہی قوموں کے بہترین دماغ جمع ہوے۔ عظیم الشان کانفرنس ہوئی۔ ایک عالمگیر صلح کی بنیاد رکھی گئی۔ مفتوح اقوام کو اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کیا گیا کہ وہ سر اٹھانے کے قابل نہ رہیں۔ نئی حدبندیاں عاید کی گئیں مجلس اقوام کا قیام عمل میں آیا۔ دنیا کا ایک نیا نظام قایم کیا گیا مگر آج وہ کہاں ہے؟ مجلس اقوام جو کئی روز سے دم توڑ رہی تھی اور جس کے متعلق خیال تھا کہ یہ "پیرک افرنگ" دوا ہیں کی تعویذ سے کچھ روز شاید سنبھل جائے گی۔ آخر میں اپنی زندگی کی آخری سانس لے ہی چکی۔ اگر قوموں کے نمایندوں کا پہلا بنایا ہوا نظام محض ایک ڈھونگ ثابت ہوا تو اب انہی اصولوں پر نیا نظام قائم ہو کر کس طرح دنیا کے لئے باعث امن ہوگا؟ ذہنیتیں کس طرح بدلیں گی؟ عداوتیں اور کینے کس طرح مٹ گئیں؟ مال و دولت و اقتدار بڑھانے کی آگ کس طرح بجھے گی؟ انہی قوم اور وطن کی پرستش کرنے والوں کے دلوں میں دوسروں کی قوم اور وطن سے کس طرح محبت پیدا ہوگی۔ اور اگر یہ نہ ہوا تو اس جنگ کی ساری قربانیاں بیکار ہوں گی۔ اور مادہ پرستوں کا بنایا ہوا نظام۔ اسی ابتری کا پیش خیمہ ہوگا۔ جو آج ۱۹۲۱ء کی صلح کا نتیجہ نظر آ رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مادہ پرستوں کی کوئی مجلس اس کا علاج نہیں کر سکتی۔ کوئی ملی صلح ہمارے لئے بہترین نظام پیدا نہیں کر سکتی۔ کوئی انسانوں کے ہاتھ کا بنایا ہوا قانون یہاں کام نہیں دے سکتا۔ یہاں ذہنیتوں کی تبدیلی کی ضرورت ہے اور جب تک ہمارے دلوں سے اقتدار اور مال کی ہوس اور قوم و وطن کی محبت نہ نکل جائے کسی بہتر نظام کے پیدا ہونے کی امید نہیں کیونکہ اقتدار کی ہوس اور مال کی محبت انسانوں کے دلوں کے میں آتش کی آگ مشتعل کرتی ہے۔ اور اس آگ پر پانی ڈالنے کا کام اگر کوئی چیز کر سکتی ہے تو وہ خدا کی محبت ہے۔ کیونکہ اس سے دلوں میں سکون پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ مذہب ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ دنیا نے مذہب کو چھوڑ کر جنگ کمایا اور پھر مذہب ہی کے دامن میں اس کو امن نصیب ہوگا یہ کتنی اچھی خبر ہے جو اخبارات میں دیکھی گئی کہ روس جیسے ملک میں مذہب کی طرف عوام کا رجحان ہو رہا ہے۔ اور لوگ اس کی افادیت پر غور کر رہے ہیں۔

اسلام کے سوا دیگر مذاہب کے پیروؤں کا عمل کہ وہ خود اپنے مذہبی قوانین بدلتے جا رہے ہیں اس کا گواہ ہے کہ ترقئ زمانہ نے سابقہ مذاہب کو ناقابل عمل بنا دیا۔ اور ان کا فلسفۂ نجات و نروان جس کا نتیجہ دنیا سے علیحدگی ہے۔ روح و مادہ اور سیاست و مذہب میں جدائی کا باعث ہوا لیکن اسلام اور صرف اسلام ہی ایک ایسا دین ہے جس کے اصول کی پابندی ہی تمام دنیا کے لئے امن کی ضامن ہو سکتی ہے۔ آج سے ساڑھے تیرہ سو سال پیشتر ملک عرب کے مختلف قوموں اور قبیلوں کی وہی حالت تھی جو آج قومیت اور وطنیت کے تخیل کی وجہ دنیا کی ہے۔ ادنیٰ ادنیٰ باتوں پر ان میں جنگ شروع ہو جاتی جو سالہا سال تک جاری رہتی۔ چند قومیں اور قبیلے ایک طرف ہو جاتے چند دوسری طرف کشت و خون کا بازار گرم ہو جاتا۔ آخر کچھ دن بعد صلح کر لی جاتی۔ مگر اس پر کچھ دن نہ گذرنے پاتے کہ پرانے کینے پھر بھڑک اٹھتے اور از سر نو جنگ کی آگ مشتعل ہو جاتی۔ قریب تھا کہ یہ سب کے سب اس آگ میں بھسم ہو جاتے کہ خدا کی رحمت قرآن کریم کے رنگ میں ان پر نازل ہوئی ذہنیتیں بدل گئیں۔ باہم بغض و عداوت کی جگہ محبت و اخوت نے لے لی جو لوگ ایک دوسرے کی جان کے دشمن تھے ایک دوسرے پر جان فدا کرنے لگے۔ آخر وہ کیا چیز تھی جس نے جانی دشمنوں کو جانی دوست بنا دیا۔ اور مختلف ممالک و اقوام کے لوگوں میں بھائی چارہ قائم کر دیا سلمان فارسیؓ۔ بلال حبشیؓ، صہیب رومیؓ اور سرداران قریش کو ایک کڑی میں منسلک کر دیا۔ رنگ و زبان و معاشی اختلاف کے باوجود تمام مسلمانوں کو بھائی بھائی بنا دیا۔ اگر بصیرت سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا۔ کہ وہ یہ مختصر کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا نتیجہ ہے جو کلمہ لفظی نہیں بلکہ معنوی ہے اعتقاد اور تخیل اس لحاظ سے کلمہ کہتے ہیں۔ وہ الفاظ ہی کا جامہ پہن کر باہر

آتا ہے۔ اس اعتبار سے ہر وہ تخیل کلمہ جامعہ کہلا سکتا ہو
جو انسانوں کی بڑی تعداد کو ایک بنا دیتا ہے۔ لیکن
کسی کلمہ کی وسعت کو وطن روک دیتا ہے۔ کسی کا پھیلاؤ
صرف نسل تک ہے اور کسی کے حدود زبان تک ہیں
اور کسی کو معاشی حد بندیاں محدود کر دیتی ہیں۔ کیونکہ وہ
ایک ملک کے لئے جامع ہیں۔ ایک طبقہ اور نسل و زبان
کے لئے جامع ہیں۔ مگر دنیا میں کئی ملک کئی زبانیں بہت
سے طبقات اور مختلف نسل ہیں۔ جن میں یہ پھوٹ کا باعث
ہوتے ہیں۔ جس پر موجودہ جنگ گواہ ہے۔ اس لئے
وہ کلمات جامع نہیں کہلا سکتے اسلام ہی کا ایک کلمہ ہے
جو مختصر ہونے کے باوجود جامع ہے۔ اس کلمہ کا صرف
لفظ لا الٰہ (کوئی محبوب و معبود نہیں) انسانوں کے
قلوب سے وطنی، ملکی، لسانی، رنگی، محبتوں کو دور کرتا
ہے اور لفظ "الا اللہ" (مگر اللہ) اللہ تعالے کی محبت
اور اللہ تعالے کی حکومت ان کے دلوں میں قائم کر دیتا
ہے اور ان تمام تازہ بتوں کو توڑ کر جن کو فکر انسانی اس
زمانہ میں تراشا ہے اللہ ہی اللہ باقی رکھ دیتا ہے۔

بر سر این باطل حق پیرہن
تیغ لا موجود الا ہو بزن

اور اس کی بندش میں کالے اور گورے، زرد و
سفید، مغربی اور مشرقی، مزدور، سرمایہ دار سب یکساں
بندھ سکتے ہیں۔ یہ اس لئے جامع ہے کہ اس میں تمام
انسانوں کو جمع کرنے کی قابلیت ہے کیونکہ اس کے
پیش نظر صرف انسانیت ہے وہ ہر مسئلہ کو انسانی
نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔

یہی مقصود فطرت ہے یہی رمز مسلمانی
یہ اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی
بتان رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

اور یہ کلمہ انسانوں کے دلوں سے مال کی محبت اور اقتدار
کی ہوس نکال اللہ کی محبت پیدا کر دیتا ہے۔ جس کا
لازمی نتیجہ اس کی مخلوق سے محبت ہے۔ کیونکہ محبوب
کی ہر چیز پیاری ہوتی ہے۔ کیا دنیا نے آج سے
ساڑھے تیرہ سو سال پیشتر نہیں دیکھا کہ اللہ کی وحدانیت
کی عملی تعلیم دینے والی ہستی جس کا اقرار اس کلمہ میں لازمی
ٹھہرایا گیا ہے۔ کیونکہ توحید کی عملی تعلیم آپ ہی کے ذریعہ
دنیا کو ملی۔ یعنی ذات بابرکت حضرت محمد مصطفے صلی اللہ
علیہ وسلم جس نے اکیس سال تک اپنے مخالفوں کے ہاتھ
سے طرح طرح کے دکھ اور تکالیف اٹھائیں اور اپنوں
کا خون خواروں کی طرح بہتے دیکھا۔ مگر جب فتح مکہ کے
وقت انہیں دشمنوں پر غلبہ ہوا تو اس کے قلب میں اور
ان دس ہزار قدسیوں کے قلوب میں جو اس کے ساتھ تھے
انتقام کا جذبہ نہ تھا۔ بلکہ محبت اور رحم کا جذبہ تھا
جس نے اپنے ظالم مغلوبوں کو یہ رحمت کا پیغام سنایا
آج ہم تمہیں ملامت بھی نہیں کرتے اللہ تمہیں معاف کرے
اور وہ سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنیوالا ہے"

زیادتی شوق اور بلند حوصلگی نے ان کا پورا پورا ساتھ دیا وہ کم سے کم مدت میں اچھے پرواز کرنے والوں میں شمار ہونے لگے تھے۔ مگر مزید ارادہ ان کا یہ تھا کہ وہ لائسنس حاصل کریں۔

بہار کا موسم اور اتوار کا دن تھا۔ آج کافی تعداد میں لوگ ہوائی اسٹیشن پر جمع تھے بعض تو تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے اور زیادہ تفریح کی خاطر۔ یکے بعد دیگرے ہوائی جہاز اترا اور چڑھ رہے تھے۔ مشینوں کی گڑگڑاہٹ اپنے خالق انسان کی قوت سماعت کو بھی مغلوب کئے دے رہی تھی۔ حسب معمول مسٹر ہاکنس اپنی کار میں کلب پہنچے اور سیدھے دفتر میں گئے۔ خلاف معمول آج ان کے چہرے سے سنجیدگی اور بے کیفی کا اظہار ہو رہا تھا۔ ان کی کبیدگی اور سوگوارانہ حالت کو یاران کلب نے ایک بہت بڑے اور کئے جانے والے مذاق کا پیش خیمہ ہی تصور کیا۔ اس لئے لوگ اپنی اپنی دلچسپیوں میں محو ہو گئے کاش انسان غائب جانتا تو شاید اسے بہت جلد ہونے والے ایک حقیقی ڈرامہ کے متعلق معلوم ہو جاتا مگر یہ کیوں ہوتا؟ جبکہ نادانی بے خبری اور ایک منزل سے بھٹکے ہوئے کا نام انسانیت ہے۔ انسان صرف انسان۔ لسانی کیفیات کا حامل جیسے اپنے پیچھے کی خبر اور نہ آگے کا پتہ۔ ساڑھے دس بجے مسٹر ہاکنس نے اپنے لئے ہوا میں اڑنے کے لئے یہ وقت منتخب کر رکھا تھا۔ آج وہ بہت اچھے اچھے کرتب دکھائیں گے،، انھوں نے اپنے احباب سے کہہ رکھا تھا۔ اس لئے ان کے حباب کی تعداد حاضرین پر غالب تھی۔

سوا دس بجے گراؤنڈ انجینیر نے اطلاع دی کہ مسٹر ہاکنس کا ہوائی جہاز تیار ہے۔ وہ کہا ہر چیز ٹھیک ہے"؟ مسٹر ہاکنس نے گراؤنڈ انجینیر سے سوال کیا۔" پٹرول کتنا ہے"؟ مسٹر ہاکنس نے دوبارہ کہا۔" دونوں ٹنکیاں بھری ہوئی ہیں۔ انجینیر نے جواب دیا۔ اس کے بعد مسٹر ہاکنس نے اپنے دوستوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ اچھا میرے دوستو خدا حافظ۔ شاید میرا آخری سفر ہو۔ آخری۔ اس سے پہلے کہ احباب اس کی وجہ دریافت کریں انجن اسٹارٹ ہو چکا تھا۔ سب کا استعجاب۔ اور جملے صرف ہونٹوں کی حرکت —— بے آواز حرکت بن کے رہ گئے۔ وہ جہاز میں بیٹھ چلے تھے۔ اور جہاز کا پروپلر انتہائی سے گھوم رہا تھا۔ پٹرول کھلتے ہی ہوائی جہاز دم اٹھا کر بھاگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے جہاز کافی اونچا ہو گیا تھا۔ جب اونچائی پانچ ہزار فٹ تک پہنچ گئی تو انھوں نے ہر قسم کے ہوائی کرتب دکھانے شروع کئے۔ رولنگ لوپ ان دی لوپ۔ فالنگ۔ لیف اسٹنٹ وغیرہ۔ ہر ایک حیرت سے ان کرتبوں کو دیکھ رہا تھا ہر ایک تحسین کے نعرے بلند کر رہا تھا۔ غرض کہ حاضرین کافی سے زیادہ محظوظ ہو رہے تھے۔ (باقی آیندہ)